اجنبی جزیروں میں
سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی مضامین
ڈاکٹر ترنم ریاض

نام : ڈاکٹر ترنم ریاض

(۲۰۱۴ سارک ادبی عزاز یافتہ)

تعلیم : ایم اے (اردو) ایم اے (ایجوکیشن)

پی ایچ ڈی (ایجوکیشن) کشمیر یونیورسٹی

تخلیقات

۱۔ برف آشنا پرندے (ہندی میں بھی) : ناول

۲۔ مورتی : ناول

۳۔ فریب خطہ گل : چارناویلا

۳۔ مرار خت سفر : افسانے

۴۔ یمبرزل : افسانے

۵۔ ابابیلیں لوٹ آئیں گی : افسانے

۶۔ یہ تنگ زمین : افسانے

۷۔ بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب : تنقید و تحقیق

۸۔ چشم نقش قدم : تنقید و تحقیق

۹۔ اجنبی جزیروں میں : مضامین

۱۰۔ پرانی کتابوں کی خوشبو : شاعری

۱۱۔ ہاؤس بوٹ پر تتلی : انگریزی سے ترجمہ

۱۲۔ ستو کہانی : ہندی سے ترجمہ

۱۳۔ گوسائیں باغ کا بھوت : ہندی سے ترجمہ

☆ مشاغل

برقی میڈیا سے وابستگی۔ درس و تدریس۔ تحقیق

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَمَارَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ

اور ہر شخص کے درجات ہیں اس کے عمل کے لحاظ سے اور نہیں ہے
تمہارا رب بے خبر ان (عملوں) سے جو وہ کرتے ہیں۔

اجنبی جزیروں میں

(سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی مضامین)

ڈاکٹر ترنّم ریاض

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

AJNABI JAZEERON MEIN

by

Dr. Tarannum Riyaz
C-11 Jangpura Extn. New Delhi-110013
tarannumriyaz@gmail.com

Year of Edition 2015
ISBN 978-93-5073-571-8
₹ 125/-

نام کتاب	:	اجنبی جزیروں میں (سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی مضامین)
مصنفہ وناشر	:	ڈاکٹر ترنم ریاض
سنِ اشاعت	:	۲۰۱۵ء
قیمت	:	۱۲۵ روپے
تعداد	:	۵۰۰
مطبع	:	عفیف پرنٹرس، دہلی۔۶

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

شمسِ تنقید و آبروئے تمثیل
پروفیسر وارث حسین علوی کے نام

مردِ دانا ہے، اُسے کب حرص کر پائی اسیر
بادشاہ اوروں کی خاطر، واسطے اپنے فقیر

ڈاکٹر ترنّم ریاض

فہرست

☆☆

ابتدائیہ

تخلیقی قلم سے اگر اخباروں کے لئے سماجی ، سیاسی ، لسانی ، یا کوئی دنیاوی معاملہ ہوتا ہے تو صحافتی زبان سے ذرا مختلف انداز میں پڑھا جاتا ہے اور یہ بھی کہ اس کے قاری دو طرح کے لوگ ہوا کرتے ہیں، ایک وہ جو اخبار بینی سے وابستہ ہو چکے ہوں اور دوسرے وہ جو اخبار کے کالمز یا مضامین میں فنی تشنگی کی تشفی چاہتے ہوں۔ ''برف آشنا پرندے'' کی تخلیق کے بعد کچھ وقت کے لیے کچھ نہیں لکھنا چاہتے تھے۔ ہمارا اس طرف خیال ہی نہیں گیا کہ ہم کبھی لکھنے کے لئے بیٹھا نہیں کرتے بلکہ کوئی تخلیقی قوت ہمارے ذہن کو تحریر پر مائل کرتی ہے اور ہاتھ میں قلم آجاتا ہے۔ بلکہ ہم نے تو کچھ وقت کے لئے پڑھنا بھی ترک کر دیا تھا کہ ذہن پر کئی جذبے قابض سے معلوم ہوتے تھے جن میں تھکن کے ساتھ ساتھ طمانیت بھی تھی لیکن یہ دماغ جو کہ زیادہ دیر سکون سے ایک مقام پر ٹِک نہیں پاتا، اطراف میں کئی طرح کی ناانصافیاں دیکھ کر پھر قلم اٹھانے میں ہی راحت محسوس کرنے لگا۔ یہ دو ہزار آٹھ (۲۰۰۸ء) کا زمانہ تھا۔ ان دنوں ہم کشمیر میں تھے کہ میاں ہمارے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر گئے تھے۔ اخبارات میں اس سے پہلے کی دو دہائیوں سے جاری دلدوز قسم کی خبریں شائع ہونے کا دور جاری تھا

(جو ابھی تک ہے) اور دل میں خدشات سر اٹھاتے تھے۔ جب متواتر کئی دن تک ذہن کو بہت سی گتھیاں سلجھانے کی کوشش میں غلطاں و پیچاں دریافت کیا تو اپنی طرف سے بساط بھر کچھ کرنے کا خیال اخباروں کے لیے کالم لکھنے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہند و پاک کے کئی اہم اخبارات کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس کے لئے اصرار بھی تھا جن میں سیاست (انڈیا) اور جنگ (پاکستان) جیسے تاریخ ساز اخبار بھی تھے۔ ہم نے اپنی وادی کے اہم ترین اخبار، ''کشمیر عظمیٰ'' سے شروعات کی کہ بغیر ٹھوس جواز کے خانہ پُری والے روایتی قسم کے کالم ہم کو لکھنا نہیں تھے اور بغیر مضمون پر تحقیق کیے ہم قلم اٹھاتے نہیں، اس کے علاوہ تحقیق طلب موضوعات مختصر بھی نہیں ہو سکتے، چنانچہ ہمارے یہ کالم مضامین کی کسوٹی پر پورے اترے۔ اخبار کشمیر عظمیٰ میں یہ ہفتے کے روز، مری خاک جگنو، کے نام سے نئے نئے موضوعات کے تحت شائع ہوتے رہے، اخبار سیاست حیدر آباد میں، ''میری فکر کے روزن سے'' اور اخبار انقلاب میں ''خامۂ خوش بیان'' کے نام سے۔ پاکستان اور لندن میں اخبار جنگ کے عالمی ایڈیشن میں اور اخبار، جہان پاکستان میں، ''موسموں کی نسبت سے''، نام کے کالم کے تحت لکھے جانے لگے۔ اپنے فکشن کے انگریزی ترجمے میں مصروفیت کے سبب ہم نے یہ سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی مضامین لکھنا بند کیے تو اداروں اور قارئین کے کتنے ہی خطوط اور ای میل آئے۔ ہم ان سب کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ہم اپنے میاں حضور، پروفیسر ریاض پنجابی کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی خواہش پر ہم نے ان مضامین کو کتابی شکل دی۔ وقت کی کمی کے سبب کتاب، پیش لفظ کے بغیر ہی چھپا چاہتی تھی مگر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے روحِ رواں بھائی سبحان نے بڑی سادگی سے پروفیسر پنجابی سے پیش لفظ لکھوانے کا

مشورہ دیا اور پروفیسر صاحب راضی بھی ہو گئے، لہٰذا ان کا بھی شکریہ۔ مختلف دانش گاہوں کے ان طلباء کا بھی شکریہ جنہوں نے اپنی تحقیق کے لیے، بغیر مخل ہوئے ہماری کتب اور ان مضامین کی مدد سے ہمارے سوانحی خاکے تیار کیے۔

ڈاکٹر ترنّم ریاض

پیشِ لفظ

ایک تخلیقی ذہن کا اپنے گردو پیش کی دنیا کو دیکھنے کا ایک الگ اور جُداگانہ انداز ہوتا ہے۔ وہ اسی زاویے سے اپنے اطراف رونما ہونے والے واقعات وحالات پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح کا ذہن اپنی بصیرت اور بصارت کے مطابق جس انداز اور نظر سے سماجیات، تاریخ اور عصرِ حاضر کی پیچیدگیوں کا تجزیہ کرتا ہے، وہ اسے ایک صحافی یا دیگر اس زمرے میں شامل صاحبِ قلم افراد سے ایک الگ اور منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

ڈاکٹر ترنّم ریاض کے مضامین کا مجموعہ ''اجنبی جزیروں میں'' جو گاہے بگاہے ادبی کالمز کی شکل میں برِ صغیر ہندو پاکستان اور دنیا کے مختلف اخبارات و رسائل میں شامل ہوتے ہیں، اسی زمرے میں آتے ہیں۔

ڈاکٹر ترنّم ریاض ایک معروف ناول نگار، افسانہ نگار، تنقید و تجزیہ نگار اور شاعرہ ہیں۔ ان کے افسانوں، ناولوں، تنقید اور شاعری کے مجموعے شائع ہو کر عالم اردو میں اور ترجمے کے ذریعے عالم بھر میں داد، تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی ادبی کاوشوں کے سلسلے میں انہیں کئی قومی اور بین الاقوامی انعامات و اکرامات سے نوازا جاچکا ہے۔ زیرِ نظر مقالات و تجزیے اردو زبان و ادب کے

لئے ایک خوشگوار تحفہ ہیں۔

یہ تجزیے مصنفہ کے حسّاس ذہن، سماجی و سیاسی رجحانات پر ان کی گہری نظر، قومی و بین الاقوامی پُر آشوب حالات کا علم اور ان کے پُر تجسس ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ لیکن ان کے اندر کی عورت جو بقول ان کے ایک پیدائشی ماں ہے، جس انداز سے ان معاملات کو محسوس کرتی ہے، وہ ان کی تحریر کو روایتی صحافیوں اور کالم نگاروں سے ممیّز و ممتاز کرتا ہے اور حالات کو دل کی گہرائیوں میں اتارنے کے بعد صفحۂ قرطاس پر سجا دینے کے عمل میں رواں جذباتی عنصر ان کے اندازِ بیان کو ایک نرم سی روانی عطا کرتا ہے۔

زیرِ نظر مقالات پر تبصرے اور تجزیے کی خاصی گنجائش ہے تاہم اختصار کی مجبوری کے پیشِ نظر چند نمایندہ تحریروں کا ذکر، مشتے نمونہ از خروارے، کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ان مضامین میں سماج میں ٹوٹتی قدریں، سماجی بے انصافیاں، اقلیتوں میں پائے جانے والی بے چینی اور عدم تحفظ کا احساس، طاقت ور سرمایہ دار ممالک کی بالا دستی، خواتین کے تئیں روا سماجی و سیاسی زیادتیاں اور دیگر اہم موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ خواتین پر ناروا زیادتیوں پر نہ صرف احتجاجی لہجہ اختیار کرتی ہیں، بلکہ تیکھے اور طنزیہ وار بھی کرتی ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو،

"یہ ایک اذیت ناک سچائی ہے کہ تشدد کی شکار یہی نازک صنف ہوا کرتی ہے" اس کے بعد حقیقت کے بارے میں طنزیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے یوں لکھتی ہیں: "میں ڈبلیو ڈبلیو ایف کی سٹیرواِئڈ کے ذریعے پٹھے نمایاں کرنے والی عورتوں کا ذکر نہیں کر رہی، اس عام عورت کی بات کر رہی ہوں جو ممتا اور محبت کی بنی ہوتی ہے اور زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے جان تو حاضر کر سکتی ہے مگر آدھی رات کو دوا کی تلاش میں گھر سے باہر نہیں جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت مرد کو

عطا کی ہے۔'' (چہ معنی دارد)

اسی تناظر میں مصنفہ بچوں کے تعلق سے اپنے ایک مقالے میں لکھتی ہیں: سری لنکا میں تمل علاحدگی پسند رہنما پربھاکرن کے معصوم بچے کی ہلاکت کا نہایت ہی دلدوز منظر پیش کرتی ہیں جس کو پڑھ کر آنکھیں نم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

ان کے مقالہ ''چاند کی خاطر'' میں یہ منظر کشی دل کو چھو لیتی ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

''کیسا لگا ہوگا اس بندوقچی کو جب اس نے ننھے سے بالا چندرن کی چند ایک انچ کی چھاتی میں آدھ درجن کے قریب گولیاں اتار دی ہوں گی؟ کتنی دور تک گئی ہوگی اس کی معصوم چیخ؟''

زیر نظر مجموعہ میں ڈاکٹر ترنّم ریاض، دنیا کے مختلف ممالک کی ثقافتی اور تہذیبی اِمیجز (Images) کے خوبصورت منظرنامے پیش کرتے ہوئے گراں قدر معلومات کا خزانہ فراہم کرتی ہیں۔ نیل کے ساحلوں سے لے کر کینڈا کے مرغزاروں انڈمان و نکوبار کے خوبصورت جزیروں، ملیشیاء کے شفاف شہروں اور لاہور و کراچی جیسے تواریخی شہروں سے قاری کو متعارف کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اِن مقامات کی سیر تو کر چکی ہیں، تاہم خاص بات یہ ہے کہ وہ اِن مقامات کے تاریخی، سماجی اور سیاسی ادوار کا بھی ادراک رکھتی ہیں۔ اُن پر تبصرے کرتی ہیں اپنے تاثرات رقم کرتے قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے دلچسپی کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں۔ یہ تحریریں پڑھ کر ایک حساس تخلیق کار کی صلاحیتوں کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا ہے۔ کہیں کہیں، مصنفہ ایک مخصوص ملک کے تواریخی ورثے، اس ملک کی سماجی اور ثقافتی قدروں اور عوام الناس کی ترجیحات و وابستگیوں کا ایک دلچسپ کولاج (Collage) پیش کرتی ہیں۔ اس کو

پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ آپ کوئی رنگ برنگ پینٹنگ (Painting) دیکھ رہے ہیں۔ اُن کے مضمون ''حمام سوپ اور کھارا پانی''، میں جو ملیشیا کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، یہ کولاج آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ اس ملک میں رہنے والے مختلف مذاہب کے لوگوں کی ایک الگ مذہبی روایات کا عکس بھی اس مضمون میں نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دلچسپ سماجیاتی حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ایک مخصوص ملک کی مخصوص مذہبی اور ثقافتی روایات جب دوسرے ملک کی سرزمین میں پیوست ہو جاتی ہیں، تو وہ کیسا روپ ورنگ اختیار کر لیتی ہیں: ملاحظہ ہو:

''.... وہاں عرصہ پہلے جنوبی ہند سے ہجرت کر کے جانے والے لوگ اپنے بھگوان شِیو کے سب سے چھوٹے بیٹے موروگن کو پوجتے ہیں۔ دوسرے یہ مجسمہ بھگوان شِیو کی مورتی سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کے گلے میں سانپوں کی مالا ہے نہ ہاتھ میں ترشول، یہ موروگن بھگوان کا اب تک کا دنیا میں سب سے بڑا مجسمہ ہے، جسکی نقاب کشائی جنوری سن دو ہزار چھ میں ہوئی۔ اسی طرح چینی نسل کے لوگوں کی بھی اپنی عبادت گاہیں ہیں اور انھیں اپنے اپنے حقوق کا تحفظ بھی حاصل ہے۔ مصنفہ ملیشیا کی بین المذہبی اور بین الثقافتی اور رواداری کو قابل تحسین گردانتے ہوئے کچھ اندیشہ ہائے دور دراز کا بھی ذکر ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''گو کہ حاسدین ملیشیا میں بھی بھیس بدل کر تاک میں ہوں گے کہ کس طرح امن کی جھیل میں تشدد کا پتھر پھینکا جائے اور فضا میں زہر گھول دیا جائے۔ اور ایسا بھی نہیں کہ سفید چہرے والوں کی کالی نظر اس پُرسکون خطے کی طرف نہ اٹھی ہوئی۔ مگر حکمت عملی اور ایمان وایقان میں بڑی طاقت ہے، جو فروخت ہونے پر تیار نہ ہو اسے کوئی خرید نہیں سکتا کہ جذبۂ حب الوطنی بھی کسی عقیدے سے کم نہیں ہوا کرتا۔ اس سرزمین کے مناظر احاطۂ تحریر میں لاتے ہوئے، عمارات، عجائب

گھر، چرند و پرند، اقدار و روایات کی تفصیل رقم کرتے ہوئے مصنفہ کی حسِ مزاح بھی یوں بھڑک اٹھتی ہے، ''ایک اور دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ حیا تین سے پُر مچھلی خوروں کے اس علاقے میں ایک بھی عورت سن رسیدہ کمزور نظر نہیں آئی، اور کسی بھی مرد کا سر گنجا نہیں دیکھا (اتفاق سے جن ایک حضرت کا سر بالوں سے خالی تھا، وہ میرے ہی ہم وطن نکلے۔''

مصنفہ ایک ادیبہ اور شاعرہ کی حیثیت سے ایک حسّاس ذہن اور نازک دل کی مالک ہیں۔ وہ امن و اخوت اور برادری کے خوشگوار سماجی ماحول کی متمنی ہیں۔ مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی اُن کا شعار رہے۔ اُن کے کئی مضامین اسی ضمن میں لکھے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں انگریز حکمرانوں کے حربے جو بین المذہبی اور بین الثقافتی تصرفات کو بڑھاوا دے کر اپنے اقتدار کے مزے لُوٹتے رہے۔ ان کی نظر میں برابر کھٹکتے ہیں۔ ایسی عیارانہ ضربوں کو اجاگر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں: ''اس ملک میں محبتوں کے وہ پائیدار رشتے ہیں، جن سے متاثر ہو کر دنیا کے دوسرے ممالک سے لوگ سکون اور مسرت کی خاطر یہاں کی سیاحت کے لیے آتے ہیں، کیونکہ کوئی جذبۂ جذبہ انسانیت سے جیت نہیں سکتا''۔

(کہ ہر ایک کارنامہ ان ہی سے منسوب کرتا ہے)

ہندوستانی روایات، فلسفہ اور تہذیب کے سلسلے میں سوامی وویکانند پر اُن کا مضمون نہایت ہی پُر اثر اور دلچسپ ہے۔ مصنفہ کا تعلق وادی کشمیر سے ہے۔ وادی کے حسین مرغزاروں، باغات، پھل اور پھول، حسین کوہسار، یہ جھلکیاں اُن کی تحریروں میں نظر آتی ہیں۔ تاہم وہ ایسے مقامات کی بھی تصویر کشی کرتی ہیں، جن سے عام سیاح تو کیا، خود کشمیر میں رہنے والے اکثر لوگ پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ اس ضمن میں وادی گریز کی کی تصویر کشی نہ صرف ان کی

تخلیقی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے بلکہ پُر از معلومات بھی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''گریز کی وادی میں جو طلسمی حسن پھیلا ہے، اس میں سوائے فطرت کے کسی کا عمل دخل نہیں ہے۔ فُسوں کاری کی حد تک حسین اس وادی کے کچھ حصے دردستان سے بھی ملتے ہیں۔ پربت وہ سب سے اونچا جو ہمسایہ آسمان کا ہے، اسکی ندی کو ہرا ہرا پانی دیتا ہے۔ اس میں ننگا پربت سے بھی پانی اُتر کر آملتا ہے۔ وادی گریز سرینگر سے تو نو (۹) کلومیٹر کی دوری پر ہے اور سطح سمندر سے قریب قریب گیارہ ہزار سات سوفٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کے جنگلات میں بُرزہ کے یعنی بھوج پتر کے درخت بکثرت ہیں، جن کے تنے اور ٹہنیاں ہلکے سفید ہُوا کرتے ہیں اور جن پر اپریل مئی میں شگوفے آتے ہیں کہ انہیں پنپنے کے لیے بارہ ہزار فٹ کی بلندی کا سرد موسم درکار ہوتا ہے۔ اس درمیانہ قد درخت کی شفاف چھال بڑی باریک اور تہہ در تہہ ہوتی ہے اور انگریزی میں اس کا نباتاتی نام Betula Utilis ہے۔ ان ہی درختوں کی چھال کا اگلے وقتوں میں کاغذ کی طرح استعمال ہوا کرتا تھا۔

مصنفہ قاری کو بھوج پتر سے متعارف کرنے کے بعد نہایت ہی معصومیت سے ایک سماجیاتی بیانیہ پیش کرتی ہیں:

''اس (بھوج پتر) کے ہر چھلکے پر برابر کی دوری میں تھوڑی تھوڑی لمبی لکیریں نقش ہوتی ہیں۔ جیسے اِنسانی ہاتھوں نے ایک ایک یا الف الف لِکھا ہو۔ اِس پر یاد آیا کہ بہت پہلے جب بچھڑے گھر کے باغ کی پُرانی دیواریں دوبارہ بنائی گئی تھیں تو مٹی میں برزے کی تہیں مِلتی تھیں۔ (والدہ صاحبہ نے بتایا تھا کہ یہ الف الف سا نقش اللہ کے نام کے لیے ہوا کرتا ہے درختوں کی چھال پر)

(مختہ ہا' روگنڈ' تھوہٹہ لولو)

اِس مضمون کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ مصنفہ نے اِس کا عنوان ایک مقبول کشمیری گانے کے مکھڑے سے لیا ہے۔

ڈاکٹر ترنّم ریاض کے مضامین کا یہ مجموعہ ایک حسین گلدستہ ہے جس میں طرح طرح کے پھول ہیں، رنگ ہیں۔ اِس مجموعہ کی اشاعت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے توسط سے ہورہی ہے۔ اِس کے لیے نہ صرف کہ کونسل شکریہ کی مستحق ہے بلکہ قابلِ مبارک باد بھی ہے کہ وہ اردو زبان وادب کو یہ خوبصورت تحفہ پیش کررہی ہے۔

فروری ۲۰۱۵ء

پروفیسر (ڈاکٹر) ریاض پنجابی

(پدم شری اعزاز یافتہ برائے تعلیم وادب)

(اعزازی) صدر، بین الاقوامی ادارہ برائے تحقیقات امن۔ نئی دلّی

(سابق) وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی

پروفیسر، فیکلٹی آف سوشل سائنس جواہر لعل یونیورسٹی نئی دِلّی۔

☆☆
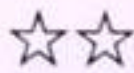
بس نازک است شیشۂ دل بر کنارِ ما

ہزاروں برس سے عظیم اور پرشکوہ دریائے نیل کے ساحلوں پر کئی سلطنتیں آباد رہی ہیں جیسے تنزانیا، روانڈہ، یوگینڈا، سوڈان، ایتھوپیا وغیرہ۔ جہاں یہ دریا کبھی سفید نیل کہلاتا ہے تو کبھی نیل گوں نیل، یا پھر کسی اور نام سے جانا جاتا ہے مگر مصر تک پہنچتے ہوئے اس تاریخی دریا کی اہمیت ان سب سے جدا اور اہم ہو جاتی ہے۔ کچھ شہرۂ آفاق شہر بھی اس کے ساحلوں پر آباد ہیں، جیسے خرطوم، سکندریہ، یا قاہرہ وغیرہ۔ یہ تاریخی دریا، 'النیل' جس کا نام یونانی لفظ 'نیلیوس' سے ماخوذ ہے، ازمنۂ قدیم میں 'اتارُو' بھی کہلاتا تھا۔ اب تک اسے شمالی افریقہ میں بہنے والا عظیم ترین دریا مانا جاتا رہا ہے مگر اب سنا ہے کہ امیران ندی کچھ اس سے بھی بڑی ہے۔

افریقہ کے شمال مشرق میں واقع ملک مصر، حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کے سبب سے تو کُل عالم میں مشہور ہے ہی لیکن ایک اور الگ طرح کی شہرت اس سرزمین کو قدیم شاہانِ مصر، ملقب فراعنہ کی وجہ سے بھی حاصل ہے۔ (بلکہ ضمناً عرض ہے کہ مجازاً لفظ فرعون ظالم کے لئے بھی مستعمل رہا ہے۔ کون جانے کس سبب سے مصری اپنے مردار خور گِدھ کو 'فرعونی مُرغ'

پکارتے رہے ہیں اور 'سانپ کھلونا'، جو کسی مرکب کی چھوٹی سی ٹکیا کے جلنے سے سانپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے، بھی 'فرعون کی چوہیا' کے نام سے جانا جاتا رہا ہے۔ ممکن ہے یہ چیزیں کسی مثبت اشارے کی حامل ہوا کرتی ہوں۔ مثال کے طور پر ہمارے یہاں اُلو اور گدھا، اُلو اور گدھا ہی ہوتا ہے، جب کہ بعض مقامات پر ان دونوں کو عقل مند گردانا جاتا ہے۔ اس سب سے قطع نظر، تہذیب کا معنیٰ تو ازل سے تغیر کا محتاج رہا ہے۔ یہ استعارہ مختلف مقامات پر ہمیشہ ہی جداگانہ انداز میں جانا جائے گا۔

مصر عرصے سے اپنی پُر اسرار اور عظیم تاریخ کے باعث تحریر، تحقیق، تصویر، اور تمثیل کا موضوع رہا ہے اور کئی حکایات و واقعات اس سے وابستہ ہیں۔ کبھی سنا گیا کہ نقب زن، کسی تین ہزار سال پرانے مدفن کا خفیہ راستہ تلاش کر کے خزانوں کو ڈھونڈنے داخل ہونے کی کوشش میں وہاں صدیوں سے مقید زہریلی گیس کے سبب جاں بحق ہو گئے کیوں کہ مصری اپنے حنوط شدہ مردوں کو نادر پتھروں اور بیش قیمت دھات کی مصنوعات کے ہمراہ دفن کر کے، اہرام کے راستے چُن دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات یہ بھی خبر ملتی کہ اُنیس سالہ فرعون، طوطنخ آمن کی موت، سر پر وار کیے جانے سے ہوئی تھی۔ (خواہ کیسے بھی ہوئی ہو کہ اب ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھلا اس قاتل کا کون کیا بگاڑ لے گا)۔ یا یہ خبر بڑے زور شور سے اور با تصویر دکھائی جاتی کہ اُس کی حنوط شدہ ممی کو سن دو ہزار سات میں دنیا بھر کے دیدار سے پہلے صرف ساٹھ لوگوں نے دیکھا تھا، (اگر اکسٹھواں دیکھ لیتا تو طوطنخ صاحب کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا تھا مگر آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے جذبات سے کھلواڑ کوئی اس قسم کی میڈیا سے سیکھے۔ ویسے اقدار کے بدلنے کے سبب خبروں سے آگہی کے بدلتے معیار نے بھی اس

طرح کی غیر ضروری خبروں کی اہمیت کے معاملے میں جلتی پر تیل کا کام کیا ہے)۔

بہر حال کچھ اہم اَذکار اور بیانات بھی مصر کی تاریخ سے جڑے ہیں جس پر صدیوں تک مقدونیائی نسل کے شاہوں کی حکومت تھی، جن کا ایک اہم شاہد عظیم اور قدیم دریائے نیل بھی ہے، جو اطراف کی جنگوں اور خونریزیوں کو اپنے پانیوں سے دھوتا رہا اور اپنی تہہ میں اَن گِنت مہلوکین کو پناہیں دیتا رہا۔

ویسے ان یونانی فراعنہ کے نام صوتی اعتبار سے بھی عجیب طرح کی دلچسپی کے حامل رہے ہیں کہ ایسے نام اکثر سننے میں پُراسرار اور ادا کرنے میں دلچسپ معلوم ہوتے ہیں (بلکہ انہیں کامیابی سے تحریر کر لینا خود مجھے ایک چھوٹا سا معرکہ سر کرنے کے برابر معلوم ہوتا ہے)۔ جیسے خنے تن، ہستتشِ پتس، ایمین ہوتف، نیفر اٹیٹی، انخی سینیمن، سینورست، تتھموسِس وغیرہ۔ تعجب کی بات یہ بھی ہے کہ تین صدی تک حکومت کرنے کے باوجود آخری فرعون کو چھوڑ کر یہ فراعنہ مصری زبان سے ناواقف ہو کر بھی مصری باشندوں کے دیوتا بنے رہے تھے جن کی، عظیم تر اور بلند تر آقا و مالک کہلانے کے سبب باقاعدہ پوجا ہوا کرتی تھی۔ آخری فرعون قلوپطرہ اپنی دو بہنوں اور والد کے انتقال کے بعد تقریباً اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئی۔ اس سے پہلے اس نام کی سات دیگر حکمران بھی ہوئیں مگر شہرۂ آفاق ملکہ قلوپطرہ یہ آخری ملکہ ہی کہلائی۔ بظاہر اس نے کبھی تنہا حکومت نہیں کی تھی۔ وہ کبھی والد، کبھی ایک بھائی شوہر کے ہمرہ اور کبھی دوسرے بھائی شوہر کے ہمراہ تخت نشین رہی کہ تنہا عورت کے حکمران ہونے کا تصور قائم نہیں تھا۔ لیکن اصل میں ان ادوار میں حقیقی معنوں میں حکومت وہی چلاتی رہی تھی۔ اس کے فاتحانہ کارناموں، ذاتی زندگی، شادیوں اور جنگوں کا شہرہ تو زمانے بھر میں ہے ہی، اس کی موت کے ساتھ بھی جدا قسم کا وقار وابستہ رہا ہے۔ کہتے ہیں

کہ یہ خاتون بے مثال حاکم تھی اور گیارہ یونانی حکمرانوں میں سب سے مقبول و معروف بھی۔ بعض تاریخ دان یہ لکھتے ہیں کہ وہ بے انتہا خوش شکل تھی اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ وہ حسین ہونے سے زیادہ ذہین تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کے سراپے سے کسی حد تک مردانگی بھی جھلکتی تھی۔ ممکن ہے بعض اوقات اس کے جنگجوانہ لباس اور فاتحانہ رویّے کے سبب ایسا معلوم ہوتا ہو مگر اکثر کہنے والے یہ بات متفقہ طور پر مانتے ہیں کہ وہ نہایت جاذب نظرِ خاتون تھی اور اسے اپنی آواز اور طرز گفتگو پر کچھ ایسا قابو تھا کہ اس کے چند جملوں سے سننے والے کا ذہن بدل سکتا تھا۔ اس کی خود اعتمادی اور دور اندیشی کا یہ عالم تھا کہ اس کی ہر حرکت میں ایک بے مثال منصوبہ ہوتا جو بظاہر والہانہ سا کوئی عمل معلوم ہوتا، مگر اصل میں ایک اہم سیاسی پیش رفت کے متقاضی ہوا کرتا۔ مثال کے طور پر 'سیزر' سے متعارف ہونے کے لیے اس نے ایک نہایت نفیس اور نازک سے قالین میں خود کو لپیٹ کر تحفہ کی شکل میں دربار تک پہنچوایا تھا، جبکہ اس کے باطن میں اصل مسئلہ حکومت مصر کا روم کو تاوان ادا کرنا تھا۔ سیزر اس کی اس ادا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور حاکمانہ رشتہ دوستانہ ہو گیا۔ قلوپطرہ جب سیزر کو دریائے نیل کی سیر پر لے گئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اہلِ مصر کس طرح قلوپطرہ کی پوجا کرتے تھے۔ وہ قلوپطرہ کو دیوی Isis کا روپ تصور کرتے تھے اور اس بات پر صدق دلی سے یقین رکھتے تھے۔ ان کے اعتقاد کے مطابق دیوتاؤں کی ماں، دیوی آئِسس جو جنت و دوزخ کی بھی ماں تھی، شاہوں گداؤں، گناہ گاروں، فن کاروں، کنواریوں، امیروں، کمزوروں اور طاقتوروں کے علاوہ بے مثال لیاقت کی یکساں دیوی تھی اور ہر دنیاوی اور آسمانی خوبی سے معمور تھی۔ اس کے بھائی شوہر، پاتال کے بادشاہ Osiris کے قتل کے غم میں اس کی اشک باری سے دریائے نیل اکثر د

بیشتر طغیانی سے پُر ہوا کرتا۔ دیوی کے معتقد عیسائیت کے بہت بعد، یعنی چھٹی صدی عیسوی تک بھی نظر آتے تھے۔ بلکہ اب بھی، بہت کم سہی مگر دنیا کے کئی اہم مما لک میں دیوی آئیسس کی پوجا ہوا کرتی ہے۔ دیوی کو گلاب کے پھول نذر کئے جاتے تھے۔ اس سبب سے ان دنوں روم کے لئے گلاب کی کاشت ایک نہایت منافع بخش تجارت تھی۔

تاریخ میں اپنی جادوئی طاقتوں کے لیے معروف، فرعونی مصر اور موجودہ مصر آج کی تہذیب یافتہ دنیا کیلئے بھی ایک دلچسپ کتاب کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ قلوپطرہ کے والد بطلیموس دوازدہم (Ptolemy 11th) کو اہل مصر پسند نہیں کرتے تھے (یہ بطلیموس وہ مشہور ہیئت دان نہیں جو دوسری صدی عیسوی میں گزرا ہے)۔ خاندانِ بطلیموس کے ارکان نے سکندر اعظم کی وفات سے لے کر قلوپطرہ کے زمانے تک مصر پر حکومت کی تھی۔ اس لئے وہ مصر چھوڑ کر سلطنتِ روما چلا گیا تھا۔ اور جاتے ہوئے اس نے تخت کا وارث قلوپطرہ اور اس کے بھائی کو بنا دیا تھا۔ مگر اس کے بھائی کو قلوپطرہ کے سیزر کے ساتھ جذباتی مراسم کا پتہ چل گیا تھا اور وہ بدلے پر تُل گیا تھا لیکن اس کو ظاہر ہے کہ راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد قلوپطرہ نے اپنے دوسرے گیارہ سالہ بھائی سے شادی کی۔ فریزر سے قلوپطرہ کا ایک بیٹا ہوا جس کو خاندانی نام بطلیموس سیزر دیا گیا تھا مگر اسے عام طور پر 'سیزرین' کہا جاتا تھا۔ روم کے باشندوں کو اپنے حکمراں کا ایک غیر ملکی عورت میں دلچسپی لینا پسند نہ آیا اور انھوں نے فریزر کو قتل کر دیا۔

(اس واقعہ کو ولیم شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے جولیس سیزر میں بڑے ہی پُر اثر انداز میں تحریر کیا ہے۔ دربار میں بروٹس کو سیزر اپنا دوست خیال کرتا تھا اور جب اس نے بھی اس پر وار کر دیا تو سیزر کے کردار سے مرتے وقت یہ جملہ

ڈرامے کی زبردست کامیابی کا نعرہ سا بن گیا جسے 'اے تو بروتے' کہا جا سکتا ہے یعنی، اور تم بھی بروتیس۔۔یا، تم بھی بروٹیس۔۔؟ غالباً یہ ادبی تاریخ کا سب سے مشہور سہ لفظی جملہ ہے۔ خدا معلوم یہ جملہ شیکسپئر کے فن کار ذہن کی اپج تھا یا پہلے سے اس حکایت کے تعلق سے رائج تھا اور واقعی سیزر نے مرتے وقت کہا تھا)۔

فریزر کا قتل قلوپطرہ اور سیزیرین کی موجودگی میں ہوا تھا۔ اور وہ خطرہ بھانپ کر اپنے بچے کو لیے وہاں سے کسی طرح نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگئی۔ سن اکیاون (۵۱) ق.م. میں جب قلوپطرہ تخت نشین ہوئی تو اس سال دریائے نیل سے منسلک نہریں مصر کی زمین کو سیراب نہیں کر پائیں جس کی وجہ سے مصر قحط کے دہانے پر تھا مگر قلوپطرہ نے اپنی حکمتِ عملی سے اس طرح کے کئی مسائل حل کیے تھے۔ مصری اس پر جان نچھاور کرتے تھے۔ اُسے مصر سے بے انتہا محبت تھی۔ قلوپطرہ تین صدیوں سے راج کر رہی مقدونیائی نسل کی پہلی اور آخری حکمراں تھی جس نے مصری زبان سیکھی تھی۔ وہ نو (۹) زبانیں جانتی تھی۔ گو کہ اس کی مادری زبان یونانی تھی لیکن وہ لاطینی نہیں جانتی تھی۔ وہ زبردست حساب دان تھی اور چوٹی کی تجارتی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ ایک پیدائشی رہنما اور حوصلہ مند ملکہ تھی۔ جولیس سیزر کے چلے جانے کے بعد قلوپطرہ کی زندگی میں جولیس سیزر کا سپاہ سالار مارک انٹنی داخل ہوا۔ اس کا ایک حریف ایک اور اہم سیاست دان آکٹیوین تھا جو اس کا برادرِ نسبتی بھی تھا۔ سپاہ سالار مارک انٹنی نے قلوپطرہ کو اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے اپنے دربار میں طلب کیا۔ قلوپطرہ کچھ ایسی آن بان سے وہاں پہنچی کہ وہ اس کے حسنِ جہاں سوز سے بری طرح متاثر ہوا اور بیالیس (۴۲) ق م کا موسمِ سرما اسی کے ساتھ اسکندریا میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ بلکہ چار سال بعد، سینتیس (۳۷) ق م میں دوبارہ اسکندریہ کی طرف روانہ ہوا اور

بالآخراس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو کر رہا اور اپنی بیوی Octavia کو طلاق دے کر قلوپطرہ کے ساتھ رہنے لگا۔ اس نے رائج الوقت سکوّں پر اپنی اور قلوپطرہ کی تصویریں ڈھلوائیں۔ مارک انٹنی سے قلوپطرہ کے دو جڑواں بیٹے اور بعد میں ایک اور اولاد ہوئی۔ ان تینوں کو رومیوں نے ناجائز کہا لیکن انٹنی نے انھیں شہنشاہ کا خطاب دیا۔ مارک انٹنی کا قلوپطرہ میں اس درجہ دلچسپی لینا آکٹیویا کو پسند نہیں آیا۔ اور آکٹیویا اور اس کے بھائی آکٹیوین نے مارک انٹنی کو روم کے خلاف باغی قرار دے کر اعلان جنگ کر دیا۔ کہتے ہیں کہ ایسی خون ریز جنگ دریائے نیل کے دو کناروں نے کوئی دو سو سال کے عرصے میں پہلی بار دیکھی تھی۔ بعض تاریخ داں یہ تک کہتے ہیں جنگ کے دوران جب مارک انٹنی ہارنے لگا تو قلوپطرہ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ یہ دیکھ کر مارک انٹنی نے اپنے آپ کو اپنی تلوار پر گرا کر خودکشی کر لی۔ آکٹیوین کے حکم سے سیزر اور قلوپطرہ کی اولاد سزیرین کو گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا۔ قلوپطرہ اپنا انجام جان چکی تھی اس نے کسی طرح اپنی چہیتی خادمہ سے انجیروں کی ٹوکری میں ایک زہریلا سانپ یا زہر منگوایا اور زہر کھا کر یا خود کو سانپ سے ڈسوا کر محض انتالیس (۳۹) سال کی عمر میں خودکشی کر لی۔ یہ ٹریجڈی اس درجے کی بلند مرتبہ سیاست دان کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے تھی۔ قلوپطرہ کی وصیت کے مطابق اسے مارک انٹنی کے پہلو میں دفنا دیا گیا، مگر اگر اس نے مارک انٹنی سے منہ پھیرنا ہوتا تو وہ ایسی وصیّت کیوں کرتی۔

(ضمناً یہ عرض کر دوں کہ اکثر شدّت سے اس بات کا خیال آتا ہے کہ چند ایک تاریخ دان ہی صدقِ دلی، غیر جانبداری اور سوجھ بوجھ سے واقعات قلم بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر، معقول چھان بین کیے بغیر، پہلے سے تحریر کردہ واقعات کی نقل کر کے، ذرا سے ردو بدل سے سہرا اپنے سر لینے سے قطعی نہیں

ہچکچاتے اور حقیقت آشکارا ہونے سے رہ جاتی ہے۔ کسی حد تک بجز کلہن پنڈت کے، کشمیر کی تاریخ کے اذکار میں بھی غلطیاں راہ پا گئی ہیں اور اس کے علاوہ بعد کو الگ شناخت کے طور پر ابھرنے والی قوم کے تئیں جانبدارانہ رویّے کی دل آزار شکل بھی نظر آتی ہے۔ ہاں وادی یا ملک سے باہر کے بعض تاریخ دانوں نے قدرے انصاف سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ مگر ضرورت اسی سرزمین کے محرّر کی ہے جو اپنی جڑوں میں اس درجہ دلچسپی رکھتا ہو کہ کسی بھی قیمت پر حقیقت جاننے کا طالب ہو، واقعات کی تہہ تک پہنچنے کی اہلیت رکھتا ہو، پرانی زبانوں سے بھی قدرے واقف ہو اور وادی کی زبان بھی اچھی طرح سمجھ سکتا ہو۔ اس کے علاوہ تاریخی ماخذ کو ماضی سے جوڑنے کی ذہانت کا حامل ہو اور کسی طرح کے تعصب کا شکار نہ ہونے کے ساتھ ساتھ خالص دیانتدارانہ اپروچ والا انسان ہو)۔

بہر حال آپ سوچیں گے کہ ہزاروں سال بعد قلوپطرہ کی جواں مرگی کا غم کرنے والی میں کون ہوں؟ دراصل بات یہ ہے کہ مصری حکومت کے تازہ ترین منصوبوں میں یہ معاملہ خصوصی طور پر شامل ہے کہ اس سال دریائے نیل سے قریب پانچ میل کے فاصلے پر واقع، قلوپطرہ اور مارک انٹنی کا دو ہزار برس پرانا مقبرہ کھود کر اس روایت کی تصدیق کی جائے کہ دو جسدِ خاکی جو ایک دوسرے کے ہم پہلو دفن ہیں واقعی قلوپطرہ اور مارک انٹنی ہی کے ہیں؟ یہ مقبرہ مصر کے شمال میں سکندریہ کے ساحلی شہر سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ حالانکہ مقبرے تک جانے والا راستہ زیرِ آب ہے لیکن آثارِ قدیمہ کے ماہرین اب اس پانی کے نکاس کا بندوبست کر رہے ہیں۔ یہ تازہ خبر ضرور دلچسپ ہے کہ آثار قدیمہ سے متعلق غوطہ خوروں نے دریا کی تہہ میں سے ادھیڑ عمر سیزر کا چھیالیس (۴۶) ق م کے دوران چھاتی تک تراشا گیا مجسمہ کھود نکالا ہے جس کے بارے میں فرانس کا کہنا

ہے کہ یہ ایک نہایت نادر مجسمہ ہے جو اولین دور کا ہوسکتا ہے مگر یہ قبریں کھودنے جیسے منصوبے، حساس اذہان کیسے قبول کر سکتے ہیں۔ آپ ڈی این اے سے اپنے اجداد معلوم کرنا چاہتے ہیں، ٹھیک ہے۔ آپ کو دوسروں سے مطلب؟

مانا کہ یہ دور صارفیت کا ہے، اس زمانے کی ہر جنس بکاؤ ہے، مگر اس کے ساتھ کیا گزرے زمانے کو بھی نہیں بخشا جائے گا۔ اس لئے کہ ماضی، کھنڈرات، مقابر اور مدفون کی باقیات بھی بکنے کی فہرست میں نمایاں مقام حاصل کر سکتی ہیں۔ ان سوالوں کا جواب کھوجنے کا سبب سوائے کمرشیلائزیشن کے اور کیا ہے؟ خبروں کے لئے متجسس اذہان، خبروں کے چٹخاروں کے لئے سیماب صفت پتلیاں، عصرانے کے وقت زلزلوں اور تباہیوں اور جنگوں کے مناظر دیکھنے والے بے حس دلوں کی تسلی اور دولت کی غلط تقسیم اور پھر اس کے نتیجے میں جرائم کے کئی کئی گنا اضافے کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟

چلیے مان لیا کہ فراعانہ متکبر تھے، ظالم تھے، خدائی کا دعویٰ کرتے تھے، انسانوں کو غلام سمجھتے تھے، اقتدار کے لیے خون بہاتے تھے یا قلوپطرہ نے اپنے چھوٹے بھائی شوہر کو زہر دے دیا۔ اور چھوٹی بہن کو قتل کروادیا۔ تو کیا اقتدار کے بھوکے اب ایسا نہیں کرتے؟

(یہ تو سیاست اور سنسنی کی خاطر یا کسی عجب حیوانی جذبے کی تسکین اور اپنے ہم خیال درندہ صفت لوگوں کی خوشنودی کے لیے اُن بے گناہوں کا قتلِ عام تک کرنے سے نہیں چوکتے اور نہ ان کی بستیاں اجاڑ کر انُہیں پر الزام دھرنے سے باز آتے ہیں، جن کو کرسی کے دعوے سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا)۔ پھر اس کا مطلب یہ تو نہ ہوا کہ ان کی آخری آرام گاہوں کو تہ و بالا کر کے بلاسبب کے اسرار کا پتہ چلانے پر مزید دولت کی حرص میں یہ تماشا کیا جائے۔ کیا روز بروز بڑھ

رہے، انسانیت سے جڑے جان لیوا مسائل حل ہو چکے ہیں۔ کیا زندگی محض نشیلے تجسُّس کی تسکین کا نام رہ گیا ہے؟ کیا کرۂ ارض کے ہر انسان کو بھر پیٹ روٹی مل جاتی ہے؟ کیا پانی کی خاطر مرنے والے انسانوں کی محرومیاں فراموش کر کے زندگی صرف عیاشیوں کا نام ہے۔؟ کیا عیاشیوں میں دو ہزار برس پرانے مُردوں کی بے حرمتی سے محظوظ ہونا شامل ہے؟ کیا آثارِ قدیمہ کی دو لفظی اِصطلاح کی حرمت اس میں نہیں ہے کہ اس کے بچے کھُچے وقار کو مزید پامال نہ کیا جائے۔ اور پھر کیا اس ٹریجڈی کے پیچھے کارفرما اذہان کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ کم از کم ماضی کے ان اَسرار پر پردہ پڑا رہنے دیا جائے، جن کے افشا ہونے سے انسانیت کی بھلائی کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھتا۔ اور اس کے علاوہ عقلِ انسانی یہ تو سمجھ ہی سکتی ہے کہ اہرامِ مصر سے متعلق یہ پوشیدہ اسرار ہی ہیں جو دنیا بھر سے سیاح ان کی ایک جھلک پانے کے لئے وہاں جمع ہوا کرتے ہیں۔ سارے راز طشت از بام ہو جائیں گے تو تجسّس کے لیے کیا باقی بچے گا کہ اسی بہانے ماضی کی کسی پُرشکوہ نشانی کی سالمیت تو نہ مجروح ہوگی۔

آنکھ کے بدلے آنکھ

کچھ عرصہ قبل اخبار کی ایک سرخی نے اُجلی اُجلی صبح کا حسن مجروح کر کے سیاہ کر دیا تھا اور کچھ وقت پہلے نظریں پھر ایک تکلیف دہ واقعے سے دوچار ہوئیں۔ اس کے بعد نئے نئے واقعات منظر پر آنے کا سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا کہ اب انصاف سے لوگوں کو غالباً امیدیں بندھنے لگی ہیں۔ مگر میرے خیال سے اس دور میں انسان کا دل بڑا کمزور ہو گیا ہے کہ بات ذرا زیادہ ناقابل برداشت ہو جائے تو طبیعت کو ایسا بوجھل کر دیتی ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھلتی۔

پچھلی خبر ممبئی شہر سے تھی۔ King Edward Memorial ہسپتال میں چھتیس (۳۶) برس سے پڑی انسٹھ (۵۹) سال کی ایک نیم جان عورت ارونا راچند ر کے لیے اس کی ایک دوست پنکی وِرانی نے ایک دن کی غذا بند کرنے کی اجازت طلب کی تھی تا کہ بظاہر حیات اس جسم کو موت آ جائے کیونکہ غذا اسے نلیوں کے ذریعے دی جاتی ہے اور وہ خود چل ہی سکتی ہے نہ بول سکتی ہے۔ اس کے علاوہ نابینا بھی ہے اور اب اس کی ہڈیاں اندر کی جانب خمیدہ ہو رہی ہیں۔ سن انیس سو چھیاسٹھ (۱۹۶۶ء) میں ارونا اس ہسپتال میں نرس کی

خدمات کے لئے منتخب ہوئی تھی اور سن انیس سو تہتر (۱۹۷۳ء) کے بعد سے ایک بے کار شئے کی طرح وہیں پڑی ہے کہ ہسپتال کے ایک خاک روب سوہن لال بالمیکی کو اس نے مریضوں کا دودھ چرانے پر افسروں سے شکایت کی دھمکی دی تھی۔ اور بالمیکی نے اس کے جسم کا تقدس پامال کر کے اسے کُتّے والے زنجیر سے گلا گھونٹ کر مارنے کی کوشش کی تھی مگر وہ مری نہیں اور ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئی۔ اس جانور نما آدمی پر صرف چوری کا جرم ثابت ہوا اور وہ محض چھ سال کی سزا کاٹ کر رہا ہو گیا۔ (سنا ہے اب وہ دلّی کے کسی ہسپتال میں کام کرتا ہے اور اس کے مجرم ماضی کی وہاں کسی کو خبر نہیں۔)

دوسری خبر بھی کچھ کم بھیانک اور تکلیف دہ نہیں، جہاں اپنی پوزیشن کا گھناؤنا استعمال کر کے ایک معصوم زندگی ختم اور کئی معصوم زندگیاں شدید طور پر متاثر کی گئیں۔ انیس (۱۹) برس قبل ہریانہ کے سابق ڈی جی پی راٹھور نے ایک نابالغ لڑکی کے ساتھ دست درازی کی اور ایف آئی آر درج کرنے پر ایسا پریشان کیا کہ اس نے تین سال بعد زہر پی کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ وہ اُس وقت لان ٹینس کی اُبھرتی کھلاڑی تھی اور راٹھور کے پاس ان کھیلوں کی سربراہی کا اضافی چارج بھی تھا۔ شکایت درج کرانے کے جرم کی پاداش میں راٹھور نے اسے سکول سے نکلوا دیا اور اس کے نابالغ بھائی کو گاڑیاں چوری کرنے کے الزام میں پکڑوایا (گو کہ بعد میں اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا تھا مگر اس بدنصیب پر تھرڈ ڈگری ٹارچر آزمایا گیا تھا)۔ وہ ظالم آدمی اس مجبور لڑکی کے گھر والوں کو آئے دن پریشان کرتا تھا۔ آخر کار وہ اپنا آبائی گھر چھوڑ کر کہیں گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ لڑکی کی سہیلی انورادھا اور اس کے والدین نے راٹھور کے خلاف مقدمہ لڑا اور اب انیس برس بعد اس مقدمے کا

فیصلہ ہوا اور اسے پہلے عدالت نے چھ ماہ کی قید سنائی اور ایک ہزار (۱۰۰۰) روپے کی رقم کا جرمانہ کیا اور اب دو (۲) سال کی سزا دی گئی ہے۔

اب ایک اور عجیب و غریب انصاف بھوپال گیس سانحے کے معذور و مجبور لوگوں کی توقعات کے ساتھ کھلواڑ کی شکل میں مجرمین کی دو (۲) سال کی سزا اور پانچ لاکھ روپے جرمانے کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ ایسے مواقع کے لئے کشمیری زبان کا یہ محاورہ بڑا صحیح بیٹھتا ہے، 'ودنہ منز اسُن' یعنی رونے کے معاملے میں مزاح کا پہلو، واقعی ایسے دلدوز جرم کی اتنی معمولی سزا کسی بھیانک مذاق کی طرح ہی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے فیصلے سن کر اور پڑھ کر یقیناً ہر ذی حس ذہن کا سکون برباد ہوا ہوگا۔ دل میں بار بار یہ بھی خیال اُبھرا ہوگا کہ آیا انصاف ایسا ہوا کرتا ہے۔ ڈیڑھ سو برس پرانی دفعات وتعزیرات کہیں نظرِ ثانی تو نہیں طلب کرتیں۔ مان لیا کہ قانون اندھا ہوتا ہے، سماعت کے لئے شواہد چاہتا ہے اور چھان بین اور ثبوتوں پر وقت مانگتا ہے مگر کیا اس فانی انسانی کی زندگی اتنی طویل ہے کہ انصاف کی اُمید میں وہ اتنا لمبا انتظار کرتے ہوئے بوڑھا ہی ہو، اور نہ اس جہانِ فانی سے کوچ کرے۔ ایک نسل جوان ہوکر بزرگ بھی ہوجائے اور دوسرے کو مقدمے کی صحیح علمیت ہی ہو اور نہ اس کے فیصلے کا انتظار؟

کیسے عجیب و غریب ہیں ہمارے قوانین۔ کیسا ہے ہمارا عدلیہ۔ اقلیتوں کے تحفظ کے لیے بٹھائے گئے کمیشنوں سے لے کر انفرادی جرائم تک ہر جگہ قانون بیچا اور خریدا جانے لگا ہے۔ سن انیس سو چوراسی (۱۹۸۴ء) میں سکھوں کا منظّم قتلِ عام، سن انیس سو بیانوے (۱۹۹۲ء) میں بابری مسجد کی شہادت یا سن دو ہزار دو (۲۰۰۲ء) میں مودی سرکار کا گجرات میں مسلمانوں پر کھلے بندوں ہر طرح کی بربریت کا مظاہرہ اور ایسے کئی اور معاملات کے فیصلے جنہیں میڈیا

اکثر دنگے کہتی ہے مگر جو محض یک طرفہ ہلاکت خیزیاں ہوا کرتی ہیں، یہ عیاں کرتے ہیں کہ، تیغ منصف ہے اور دار ورسن شاہد ہیں تو؏

'بے گناہ کون ہے پھر شہر میں قاتل کے سوا'

یہاں جسے میڈیا میں ثبوت سمیت مجرم گردانا جائے گا وہ کچھ وقت بعد آپ کو باعزت بری نظر آئے گا اور اپنی پہلی پوزیشن پر براجمان بھی کہ افسر شاہی کے ساتھ ساتھ آپ کو بعض اوقات صحافت بھی سفید جھوٹ میں لپٹی پیلی خبریں سناتی نظر آئے گی۔ اگلے وقتوں میں ایسا نہیں تھا۔ میڈیا اور غلط بیانی ایک سکے کے دو رُخوں کی طرح نظر نہیں آتے تھے۔ اخبار کا وجود سچ عیاں کرنے کیلئے ہی عمل میں آیا تھا۔ اب اس کے ساتھ برقی میڈیا مل کر بڑی آسانی اور ڈھٹائی سے مؤقف بدلتا نظر آیا کرتا ہے کہ اقلیتوں کے پاس میڈیا کا بھی فقدان ہے۔ زمینوں نے تیل کیا اُگلا کہ پوری دنیا مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے پر تُل گئی اور میڈیا نے ایسے ثبوت گڑھے کہ انصاف کی دیوی، دیویوں والی بلندی سے اتر کر صرف ایک پتھر کا بت ہوگئی اور بے دست وپا نظر آنے لگی۔

کُل عالم کی سیاست کو چند سرمایہ دار قابو میں رکھے ہوئے ہیں، ایسے میں سانس لینے کی خاطر ہر انسان کو اپنے لئے فضا چاہیے اور اس فضا کے لیے حکمت عملی۔ مگر جہاں یہ بات ذات تک ہی محدود ہو وہاں اوروں کا بھلا کیسے ہوگا۔ اور جب اوروں کا بھلا نہیں ہوگا تو آپسی رنجشوں کے شکار لوگ کبھی متحد نہ ہوں گے۔ یہ بات ہر مقصد پر صادق آتی ہے۔ چار لوگوں کے کنبے پر، دس افراد کے خاندان پر، شہر پر، ملک پر پوری قوم پر یا کرۂ ارض پر۔

دیکھیے بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ انسان کے ساتھ دوسرے انسان کی زیادتی پر اگر دیانتدارانہ تحقیق نہ کی جائے تو اس عمل

میں بہت سے اور لوگ بھی ظالم اور مظلوم بنتے چلے جاتے ہیں اور یہی بات مندرجہ بالا تینوں خبروں سے سامنے آئی تو سکون غارت ہو گیا۔ یہاں بات کا رُخ ایک بار شاید پھر بدلتا نظر آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسی طرح کے ایک شدید نوعیت کے جرم کے خلاف کیے گئے ایک منصفانہ فیصلے سے مجھ ایسے کئی رقیق القلب انسانوں کی ڈھارس بندھی ہوگی جس میں کچھ عرصہ قبل لاہور کی ایک عدالت نے شیر محمد اور امانت علی نام کے دو بھائیوں کے کان اور ناک قلم کر دینے کے حکم کے ساتھ لاکھوں روپے جرمانہ اور پچاس برس کی قید بامشقت کی سزا سنائی کہ کم بختوں نے اپنی چچازاد فضیلت بی بی کو امانت علی سے شادی کا پیغام قبول نہ کرنے کی پاداش میں پھانسی لگانے کی کوشش کی تھی اور اس میں ناکام ہو کر اُس غریب کے کان اور ناک کاٹ لئے تھی جسے دیکھ کر اس کی ماں کا دل بیٹھ گیا اور جان چلی گئی تھی۔ گویا یہ فیصلہ آنکھ کے بدلے آنکھ والا معاملہ ہوا اور جرمانے کے ساتھ ہوا اور بہت اچھا ہوا۔ یہ قانون جنرل ضیاء نے سن انیس سو اناسی (۱۹۷۹ء) میں لاگو کیا تھا مگر اگر ظلم کا شکار انسان ظالم کو بخش دیتا تو بات الگ تھی۔ دیکھا جائے تو فضیلت بی بی والا تشدد بھی Honour Killing والے معاملے کی طرح ہے یعنی خالص جہالت پر مبنی۔ اللہ جانے بعض اوقات یہ مردذات کس کس مسئلے کو اَنا کا مسئلہ بنا دیتی ہے۔ خوش قسمتی سے فضیلت بی بی کے مقدمہ کی سنوائی دہشت گردی مخالف قانون کے مطابق ہوئی ورنہ دوسری صورت میں شیر محمد اور امانت علی، دونوں جانور نما انسان بھی، سابقہ ڈی جی پی راٹھور کی طرح مسکراتے نظر آتے یا شرافت کا لبادہ اوڑھ کر مزید جرائم کی تاک میں دندناتے پھرتے۔ بھوپال گیس سانحے کا فیصلہ ایک تاریخ ساز فیصلہ ہو سکتا تھا مگر نہیں ہوا۔ انسانی حقوق کے شور کے اس دور میں ایسا فیصلہ دنیا بھر کی عدلیہ پر سیاہ دھبہ معلوم ہوتا

ہے۔ مگر لوگ انصاف سے امید نہ رکھیں گے تو کہاں جائیں گے۔ اب بھی اگر مقدمات کی سماعت زیادہ سرعت سے نہ ہونے لگے گی تو پھر کب ہوگی کہ اب بھی کچھ نہ ہوا تو پھر کبھی نہ ہوگا۔ فاضل جج صاحبان جہاں مدعی کی تسلی اور مجرم کی سزا پر قدرت رکھتے ہیں وہیں سماج کے لئے نئی مثالیں قائم کر کے انسانیت کی بقاء کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ خدا کرے کہ مستقبل کا ہر منصف صحیح معنوں میں انصاف پسند اور انسان دوست ہو۔

داستاں تک بھی نہ ہوگی

کچھ عرصہ پہلے ایک خبر پڑھی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر خاتون نے ایک باریش ہم سفر کے قریب دندخلال پڑا دیکھ کر جہاز کے عملے کو ممکنہ خطرے سے آگاہ کیا تھا اور جہاز کی اُڑان کچھ گھنٹے ملتوی کرنا پڑی تھی کہ دوبارہ ہر شے کی security check کے بعد ہی سفر کی اجازت ملی تھی کہ باریش شخص کے پاس سے کوئی مشتبہ شے برآمد نہ ہوئی اور معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔

گذشتہ روز پھر ایک خبر پڑھی کہ ایک اسلامک اِسکالر کو ایک کانفرنس میں شرکت کی خاطر دلی سے لندن جاتے ہوئے جہاز سے اُتار دیا گیا۔ پچاس سالہ مولانا صاحب اپنے موبائل فون پر کسی سے کہہ رہے تھے کہ پندرہ بیس منٹ میں جہاز اُڑنے والا ہے اور بعد میں انہوں نے عربی زبان بولی تھی جسے سن کر برابر میں بیٹھی ایک نوجوان خاتون کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ممکنہ خطرے سے متعلقہ عملے کو مطلع کیا۔ بقول ان کے مولانا نے کسی کو اطلاع دی تھی کہ یہ جہاز دھماکے سے اُڑنے والا ہے اور اس کے بعد مولانا نے عربی زبان میں اس کی تفصیل بھی فون پر بتائی تھی۔ اس طرح ایک ذی عزت دانشور کو آناً فاناً میں جہاز سے باہر کر دیا گیا اور تلاشی کی مہم دوبارہ رُو بہ عمل آئی۔ خاصے وقت کے بعد

جہاز اُن کے بغیر روانہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ مولانا صاحب کے پاس سے کوئی قابل اعتراض شے نہ ملنی تھی نہ ملی اور معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔

کیا معاملہ واقعی ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے؟ آزادی کے تریسٹھ (۶۳) برس گزر گئے ہیں اور مسلمانوں کے تئیں کسی خاص ترقی کی کوئی واضح شکل سامنے نہیں آئی بلکہ کچھ نسل پرست گروہوں کے زیرِ اثر منصوبہ بند طریقے سے مسلمان خواتین و حضرات کی کئی انداز میں حق تلفی ہوتے ہوتے اب نوبت ان کے ظاہری حلیے کو بھی مشتبہ قرار دیے جانے تک آ گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی مثالیں ہیں مگر ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ۔ ان باتوں سے ذہن میں کئی سوال اُبھرتے ہیں اور بہت سے خدشے سر اُٹھاتے ہیں۔

ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت جو تقسیم کے وقت بہ آسانی سرحد پار جا سکتی تھی، نہیں گئی کہ اپنے مادر وطن سے انہیں محبت تھی اور اپنے ہم وطنوں سے بھی۔ جب کہ ہم وطنوں کے پاس ہندوستان میں رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا مگر مسلمانوں نے وطن کے لئے ہندوستان کا ہی انتخاب کیا کہ اپنے اس عزیز وطن کو فرنگیوں سے آزاد کرانے میں اپنا خون فخر سے بکثرت بہایا تھا مگر ابھی تک آزادی صحیح معنوں میں ان کو نصیب نہیں ہوئی اور ایک زمانے سے شاکر و صابر مسلمان اب سوچنے لگا ہے کہ کیا یہ ہی تعبیر تھی آزادی کے حسین خواب کی۔

اسلامی اِسکالر نے ظاہر ہے کہ موبائل پر جہاز کے اُڑان بھرنے کی خبر اپنے کسی عزیز کو دی ہوگی اور بعد میں سفر کے دوران پڑھی جانے والی دُعاء کی بات ہوئی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ دُعاء عربی میں ہی ہوگی۔

مگر آخر کیا سبب ہے جو اس طرح کے معاملات سامنے آتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں تو اپنی گنگا جمنی تہذیب پر بڑا فخر تھا پھر یہ دوریاں اور نفرتیں

کون پیدا کیے چلا جا رہا ہے۔ کس کے اثر میں آ گئی ہماری محبتوں والی فضا۔

دنیا کی بڑی طاقت نے منصوبہ بند طریقے سے اسلامی ممالک میں قدم جمائے کہ سیاسی قوت کے اور پیچھے بھی سرمایہ داری ہی کام کیا کرتی ہے اور روغنی زمین اور ہیروں کی کانوں کا لالچ ایسے اذہان کے نزدیک دوسروں کی زندگی کا کوئی مول نہیں رہنے دیتا۔ مگر ان روغنی زمینوں کے عیاش جُہلاء نے انہیں ایسا کرنے میں نہ صرف آسانیاں فراہم کیں بلکہ عالم اسلام کے مستقبل کو بھی داؤ پر لگا دیا اور ادھر باقی مسلم دنیا اس سرزمین کی سربراہی خود ہی تسلیم کرتی رہی (بے سبب ہی) جبکہ انہوں نے کسی سیاسی دانش مندی کا ثبوت بھی نہیں دیا۔ (مگر جذباتی لگاؤ ہونا ایک یقینی بات بھی تھی)۔ ان بے حسوں کو اپنی اس عظمت کا خیال ہی نہیں آیا جس میں دُنیا بھر کا علم، تہذیب اور تاریخ اپنے عظیم ترین شواہد کے ساتھ موجود تھی۔ انہوں نے اپنی سرزمین پر غیروں کو colonies بنانے کی آزادی کے ساتھ زمانے بھر کی آزادیاں فراہم کر کے اپنے سارے خطے سے دشمنی کی جس کا نتیجہ زبردستی لادی گئی خلیجی جنگوں میں ہم دیکھ چکے ہیں اور دوسرے کئی انداز سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ کُل عالم اسلام سے غداری تھی اور اس بات کا بھی کہیں کہیں سے پیش خیمہ کہ اب کسی بھی ملک کی سالمیت خطرے میں آ سکتی ہے اور اسلامی ممالک کی تو اور بھی آسانی سے۔

کیا بنیاد ہے سرحد پار کی دہشت گردی کی؟

کیا حقیقت ہے نائن الیون کے حادثے کی؟

کیا صداقت ہے چھبیس گیارہ کے حملے کی؟

شہید ہیمنت کرکرے کی بُلیٹ پروف جیکٹ کسی دوسری جگہ کیوں پائی گئی تھی؟

بٹلہ ہاؤس کا فرضی تصادم اپنی حقیقی شکل میں کب عیاں ہوگا؟

یہ اور ایسے کتنے ہی سوالات مسلمانوں کی نفسیات سے جُڑ کر ان کی راتوں کی نیند حرام کیے ہوئے ہیں اور یہ بھی کہ رہ رہ کے مختلف علاقوں میں دنگوں کے نام پر مسلمانوں پر حملے کیوں ہوتے ہیں اور ان حملوں کا مجرم بھی مسلمانوں کو ہی کیوں ٹھہرایا جاتا ہے۔ گویا جھوٹ نے اپنے سیاہ لبادے میں ہر صداقت کو چھپا رکھا ہے۔ مگر کب تک آخر؟

یہ معاملات سمجھنا جتنے آسان ہیں انہیں ثابت کرنا اتنا ہی دشوار ہے کہ عام خیال یہ ہے کہ نہ تو آپ سن انیس سو چوراسی (۱۹۸۴ء) کی یک طرفہ ہلاکتوں کو کسی کے خلاف ثابت کر پائے ہیں نہ آپ گجرات کی ہلاکتوں کے ذمہ داران کو سزا دلوا سکیں گے مگر ابھی بھی مسلمانوں کو اپنے جمہوری نظام پر بھرپور اعتماد ہے کہ وطنِ عزیز میں سازشیں کرنے والوں سے زیادہ تعداد پُر خلوص لوگوں کی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے معروف و مقبول صحافی کُل دیپ نیّر نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ مسلمان تو خود اس تلاش میں ہیں کہ ملک میں دھماکے کون کر رہا ہے۔ گویا ہر متوازن ذہن متعصب اذہان کی سازشیں خوب سمجھتا ہے۔

اوباما سے اسلامی دنیا کو کچھ امیدیں بندھی ضرور تھیں مگر اب شبہات پھر سر اٹھا رہے ہیں۔ کہتے ہیں انصاف میں دیر ہو جانا انصاف نہ ہونے کے برابر ہے۔ ادھر تو دیر ہی دیر بلکہ اندھیر نظر آ رہا ہے کہ اب اپنی اس سرزمین پر بھی یہ چلن چل نکلا ہے کہ مسلمانوں کو بلا سبب ہی پریشان کیا جائے۔ کیا یہ منصوبہ بند معاملے نہیں ہیں کہ مغربی مما لک کی طرح ہماری جمہوریۂ ہند کے عوام کے دلوں میں اس قوم کا ایسا خوف بٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ہر مسلمان انہیں تباہی پھیلانے والا تخریب کار ہی نظر آتا ہے۔ ہر غلط کام کے لیے یہی موردِ الزام ٹھہرایا

جاتا ہے۔ کیسے کیسے مسئلے ہے۔ مسئلوں سے یاد آیا کہ دو ایک برس پہلے ایسے ہی ایک واقعے میں دو (۲) باریش شریف آدمی کسی ریستوران میں گفتگو کے دوران بعض مسائل کا ذکر کر رہے تھے جسے کسی سننے والے نے میزائل سمجھ کر پولیس بلوالی تھی۔ تو کیا واقعی یہ ڈر ہے یا نفرت کے اظہار کے بہانے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ نفرتیں کہاں سے آئیں۔ یہ نفرتیں کہیں ایسی سازشوں کا حصہ تو نہیں جنھوں نے گاندھی پر گولی چلوائی تھی۔ جنھوں نے نہرو کی پسندیدہ زبان اردو کو بیگانہ بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، اسی اردو کو جس میں لکھے گئے قومی ترانے آزادی کے متوالوں کے اندر نیا ولولہ بھر دیتے تھے۔ اردو کے بولنے اور پڑھنے والوں کو اِسکولوں اور اساتذہ سے محروم رکھا اور علم و ادب کے گہواروں کو قمار خانوں اور افیمچیوں کی آماجگاہ میں تبدیل ہونے دیا کہ ایک حسین زبان کو سمجھنے والے کم ہوتے گئے ورنہ مسائل کا معنیٰ میزائل نہ سمجھا جاتا۔

سچ پوچھیے تو اصل دِلّی جب فرنگیوں کے ہاتھوں اجڑی تھی، کبھی قاعدے سے بسائی ہی نہیں گئی۔

اب ذرا مغرب کی ایک اور حکمت دیکھیے کہ کس کس انداز سے یہ مشرقِ وسطیٰ کے عظیم تہذیبی ورثے سے غیر محفوظ رہے ہیں۔ مسلمانوں کو ہر طرح سے غلط ثابت کرنے کے علاوہ یہ لوگ اپنی مجرمانہ دور اندیشی کے سبب ایک زمانے سے وہاں کے علوم و فنون کو باقاعدہ تھیوریز تراش تراش کر اور گویا اسلامی کارناموں کا بپتسمہ کر کے خود سے منسوب کیے جا رہے ہیں۔ یہ میزیں اور کرسیاں مغرب میں نہیں بلکہ سب سے پہلے مشرقِ وسطیٰ میں استعمال ہوتی تھی۔ کانٹے چمچ بھی وہیں سے آئے اور اسی طرح ادب و فن، ریاضی و سائنس، ہیئت و طب اور نہ جانے کیا کیا معرکہ آراء علوم وہیں سے نکل کر دنیا میں پھیلے۔ اس ترقی

یافتہ اور ذہین قوم کی طرف سے یہ ان کا جذ بہ عدم تحفظ تھا کہ انہوں نے صدیوں منصوبے بنائے اور اب ایک طویل عرصے سے پھر باقاعدہ اور پُر تشدد انداز میں اس پر عمل پیرا ہیں۔

تو پھر ہمارے پاس کون سا راستہ بچتا ہے؟ کیا ہم اپنے گمشدہ ورثے کا ماتم کر کے باقی ماندہ زندگی گذار دیں؟

کیا ہمارے پاس کوئی مُثبت راستہ نہیں ہے؟

بالکل ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اب ہمیں اوروں کے مظالم کا ذکر کر کے خود ترحمی کا شکار نہیں ہونا۔؟

کیوں کہ غلطی ہماری بھی ہے اور وہ ہے علم کا فقدان۔ اور ان سارے شرمناک معاملات سے فرار کا ایک ہی تدارک ہے اور وہ ہے تعلیم۔

میری وادی کے شاہ فیصل نے یہ ثابت کر دیا ہے اور اس کے ساتھ شوکت پرے، رئیس بھٹ اور میر عمیر نے بھی، کہ ہر ماحول میں انسان اپنے خوابوں کا تعاقب کر سکتا ہے۔ ملی ٹینسی کے دوران وادی سے جانے والے یا کسی ناکام سیاسی مصلحت کے تحت بھیجے جانے والے ہندو برادری کے کچھ افراد کی محرومیاں سنسنی پھیلانے پر یقین رکھنے والی میڈیا نے مثال بنا کر پیش کیں جبکہ ان سے کئی گنا زیادہ مسلمانوں کو بھی نقلِ مکانی کرنا پڑی تھی۔ یہاں رہنے والے کس کس ظلم وستم سے دوچار ہوئے اور ہنوز دوچار ہیں، یہ بات کسی نے نہیں کہی، کیوں کہ اکثریت یہاں مسلمانوں کی ہے اور وہی نفرت پرست حکمتِ عملی یہاں بھی صادق آتی ہے۔ فیصل کی خبر کے بہانے کم از کم جانب دار ذرائع ابلاغ کو یہ لکھنا پڑا کہ فیصل کے والد بھی تشدد کے شکار ہوئے تھے۔

بہر حال علم کی کامیابیاں اپنی جگہ مُستند ہیں۔

قوم میں علم عام ہوگا تو اسلام کی اصل شکل سامنے آئے گی نہ کہ بگی ہوئی، کہ سچے مسلمان وہ نہیں کرتے جو اسلام کے نام پر داغ کی طرح نظر آئے۔ کہ یہ یا تو بہروپیے خود ہیں یا ان کے خریدے ہوئے نام نہاد مسلمان اور عام دنیا خواہ ملک میں یا باہر، جو امن پسند ہے، اسلام کو پہچانے گی تو مسلمانوں کی قدر بھی بڑھے گی کیوں کہ حقوقِ انسانی کی خلاف ورزیوں پر شور مغرب میں بھی مچتا ہے اور مشرق میں بھی اور انسانیت کو اول درجہ دینے والے ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔

برطانیہ کی عیسائی کابینہ میں پہلی دفعہ مسلم خاتون سیدہ حسین وارثی وزیر بنیں اور تین مسلمان خواتین، یاسمین قریشی، شبانہ محمود اور روشن آرا علی کی پارلیمان میں کامیابی انسانیت کے سنہرے مستقبل کا پتہ دیتی ہے کہ خواتین امن پسند مخلوق ہے اور میرے خیال سے دنیا کی سیاسی باگ ڈور اُنہیں کو سونپ دی جانی چاہیے۔

اس بار دلی میں CBSC نے یہ دکھادیا کہ اردو میڈیم کے طلباء مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں اور اس دفعہ ان کے نتائج اٹھاسی (۸۸) فی صدر ہے۔ یہ بات بڑی حوصلہ بخش ہے کہ توازن قائم ہوگا تو منطق کارگر ہوگی ورنہ علم کا فقدان نسلوں کے استحصال کے لیے خام مواد مہیا کرتا چلا جائے گا۔

آیئے اپنی قوم کو علم کے زیور سے آراستہ کرنے میں جُٹ جائیں اور مین سٹریم کا حصہ ہو کر ہر قسم کے گِھناؤنے الزامات سے بَری ہو جائیں کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی معصومیت سے کبھی کوئی کھلواڑ نہیں کرسکتا۔

ورنہ پھر کل کو ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

☆☆

چہ معنیٰ دارد

ٹیلی ویژن پر خبروں کے دوران کچھ سکینڈ کی ایک متحرک تصویر دیکھ کر ایک پرانی بات یاد آئی۔ ہمارے وہاں ایک رشتے کی بہن بہنوئی کی جوڑی خاندان میں ایک مثالی جوڑی مانی جاتی تھی۔ کوئی بزرگ بی بی کسی نو بیاہتا دولہے کو نصیحت کرتیں تو اس کامیاب جوڑے کی مثال ضرور دیتیں، کہ دیکھو تمہارے فلاں بھائی کس خوبصورتی سے دہائی بھر سے رشتہ نبھار ہے ہیں اور دو دونوں میں سے کسی نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ شام ڈھلے گھر آ جاتے ہیں۔ بچوں کو برابر وقت دیتے ہیں۔ بیوی کی ہر بات کا احترام کرتے ہیں۔ ان کی بیوی ہر وقت مسکراتی، خوش وخرم نظر آتی ہے۔ بچے صحت مند اور گھر کا نظم ونسق قابل رشک ہے۔ بی بی یہ بھی کہتیں کہ گھر کے کامیاب ماحول کے لئے اس جوڑے کی تقلید ہی کام آئے گی۔

خاندان بھر کے بچے بڑے ہونے کی عمر تک کامیاب جوڑے کی تعریفیں سنتے رہے تھے، جب کہ خود مجھے رشتے کے ان بھائی صاحب کی تعریف ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بہت پہلے کبھی کبھار چھٹیوں میں آ کر سارے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اور ساتھ میں غلطی کرنے پر بچوں کے چہروں پر

تھپڑ بھی جڑ دیتے تھے۔ خیر چونکہ یہ بات اُن دنوں بڑوں کے لئے عام سی بات تھی، اس لئے بچوں کا یہ درد کوئی نہیں جانا کرتا تھا اور بچے رو رو کر چُپ ہو جاتے کہ والدین استاد کی مار کو روایتاً 'رزق دینا' کہا کرتے تھے۔

خاص بات یہ تھی کہ بھائی جان کا تھپڑ مارنے کا طریقہ عام رائج طریقے سے الگ تھا جس میں مارنے والا ہاتھ لہرا کر ڈھیلی سی انگلیوں سے چپت لگا دیتا ہے اور لکیریں پڑیں تو آڑی آڑی پڑتی ہیں۔ بھائی جان اپنے ہاتھ کی اُنگلیاں سیدھی تان کر ہاتھ کو جلدی جلدی ہلا کر پہلے گویا نشانہ باندھتے اور ستم زدہ رخسار پر نظریں جما کر عین درمیان میں تھپڑ جڑ دیتے۔ ان کی چار اُنگلیوں کے درمیان کے تین متوازی خطوط، پھول سے گال پر چھالوں کی طرح ظاہر ہو اُٹھتے۔ سیدھی لکیروں والے یہ زوردار تھپڑ بچوں کے درمیان بھائی جان کی شناخت بن گئے تھے۔ کسی بچے کے چہرے پر یہ نشان دیکھ کر باقی بچے باقاعدہ بھائی جان کے مرنے کی دُعائیں مانگتے۔ اکثر دل ہی دل میں اور تخلیے میں بآوازِ بلند۔

خیر یہ بات پُرانی تھی اور بھائی جان اب خاندان بھر میں ایک مثالی شوہر ثابت ہو چکنے کے علاوہ اچھے باپ کے طور پر بھی جانے جاتے کہ دو ننھی مُنّی بیٹیوں پر انہوں نے کبھی ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا اور بیگم کے لئے تو پھول چھڑی بھی بہت زیادہ ہوا کرتی ہے۔ اور پھر ہمارے ہم عمر بچے اب بڑے ہو کر ان کے سیدھے سرخ دھاریوں والے تھپڑوں کو بھول چکے تھے۔ ویسے بھی حکم ہے کہ تلخیوں کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہیے اور نفرتیں درگزر کر دینی چاہئیں۔ لیکن اُن دِنوں ایک چھوٹی سی بچّی کو پڑھاتے وقت، اس کے چہرے پر بھائی جان کا تھپڑ مجھے کبھی نہیں بھولا کیونکہ بھلے ہی بھائی جان نے اُنگلیاں تان کر اس کے نازک سے رُخسار کو ہی نشانہ بنایا تھا مگر ان کی چھنگلیا اس کے کان سے اس زور سے ٹکرا گئی

تھی کہ تازہ چھدے اس کے ننھے سے کان کی گلابی سی لَو سے چھوٹے سے موتی والا سرخ کن پھول گرا تو اس کے پیچھے ہی خون کا ایک قطرہ بھی ٹپکا تھا۔ جب پھر سیکنڈ بھر میں اس کی آنکھوں میں لبالب آنسو بھر آئے تھے اور اس نے اپنے چھوٹے سے ہاتھ کی ساری انگلیاں کان کی کُچیا پر رکھ کر زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا اور یہ دیکھ کر میرا جی بے تحاشا بھائی جان کی 'سموسے' ایسی بڑی ناک توڑ مروڑ کر زمین پر پھینکنے کو چاہا تھا۔ بلکہ اُس منظر کے یاد آنے سے اِس وقت بھی چاہ رہا ہے۔

خیر! سنجیدگی سے سوچا جائے تو یہ ایک اذیت ناک سچائی ہے کہ تشدد کی سب سے بڑی شکار یہ ہی نازک صنف ہوا کرتی ہے جس کا قصور نہیں ہوتا مگر میں تعصب اور فرقہ پرست قوتوں کی بات نہیں کر رہی، میں غیروں کی بات ہی نہیں کر رہی، یہ تو اپنوں کا ذکر ہے۔ دوسروں نے جو ستم ڈھائے، انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کیں اور خوف و دہشت کی انگنت کہانیاں رقم کیں، وہ سب ایک مسلسل تکلیف دہ عمل کے احساس کی شکل میں اذہان کے لاشعور میں بس چکا ہے۔ میں نے تو خبروں میں اپنے ہی ہم قوم و ہم زبان، بارِیش وردی پوش کو ہاتھ میں لمبی سی لکڑی لیے اپنی ہم وطن خواتین پر پے در پے حملے کرتے دیکھا تو آنکھیں بھر آئیں، کہ ان کے پتھر نُما سینوں کے سنگ لاخ دلوں کے اندر اگر رحم نہیں ہے تو خدا کا خوف بھی نہیں۔؟ بڑی دلدوز شکل ہے طاقت کی ہمارے یہاں۔ کسی بھی تشدد پسند واقعے کی مثالیں پیش کر سکتی ہے۔ قدرت نے اس مضبوط عورت ذات کو جسمانی طور پر کمزور بنایا ہے۔

میں ڈبلیو ڈبلیو ایف کی، سٹیورائڈز کے ذریعے پٹھے نمایاں کرنے والی عورتوں کا ذکر نہیں کر رہی بلکہ اس عام عورت کی بات کر رہی ہوں جو ممتا اور محبت

کی بنی ہوتی ہے اور زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے جان تو حاضر کرتی ہے مگر آدھی رات کو دوا کی تلاش میں گھر سے باہر نہیں جاسکتی۔ اللہ نے یہ فضیلت مرد کو عطا کی ہے۔

میں اس عورت کی بات کر رہی ہوں جس کا ہتھیار، جس کی دُعا، جس کی اُمید صرف اس کے آنسو ہوا کرتے ہیں، جنہیں وہ ساری عمر کثرت سے بہاتی رہتی ہے۔

اور اس عورت کی بات کر رہی ہوں جس کا دل ستم سہہ سہہ کر اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ بات بات پر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

اور اس عورت کی بات کر رہی ہوں جس کا جگر چُپ چاپ درد برداشت کرتے کرتے چھلنی ہوتا رہتا ہے اور وہ اُس وقت بھی سوائے رونے کے کچھ نہیں کر پاتی۔

اور یہ بھی ایک صداقت ہے کہ دنیا کا ہر نارمل انسان روتا ضرور ہے اور جب ہر رونے والا یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ دو (۲) آنسوؤں کے آنکھوں میں بھر آنے کے عمل کے پیچھے کیا کیا ہوا ہوتا ہے، تو پھر کیوں وہ کسی کو رلاتا ہے کہ یہ آنسو یوں ہی آنکھ میں نہیں آجاتے جب روح میں سو (۱۰۰) برچھیاں سی اترتی ہیں اور نس نس میں ہزار چھید ہوتے ہیں، تب جا کر ایک آنسو چھلکنے کے لئے آنکھ تک پہنچتا ہے۔

گھریلو مسئلے ہوں یا دنیاوی، سب جھگڑے ان ہی اقتدار کے بھوکے اور زورِ بازو پر غرور کرنے والوں کے ہیں۔ جنہوں نے تاریخ کے پنّوں پر عجیب گھناؤنی شکلوں میں سرخی مائل سیاہی مل دی ہے۔ جنہوں نے طاقت کے لیے والدین کو قید کیا۔ بھائیوں کے خون کیے۔ بہنوں کو بیوہ کیا۔ شیر خواروں کو قتل کیا۔ یہ قوم ایک جدا قوم ہے کہ جب تک اس کی اپنی نسوں تک زہر نہ پہنچ جائے، اسے

رحم نہیں آتا۔

بہرحال دنیا اسی لئے قائم بھی ہے کہ اس میں ممتا سے بھرے دل والے مرد بھی پائے جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ مرد ذات ایلینز سی معلوم ہوتی ہے۔ کسی اور دنیا کی کوئی انجانی مخلوق، کسی اور مٹی سے بنا ہوا آدمی، کوئی ایسی مخلوق جو عورت ذات سے کہیں سے بھی میل نہیں کھا سکتی۔ یہ جذبوں کو اذیت میں بدل سکتا ہے۔ بدلے کی آگ میں سلگ کر جسموں کا تقدس پامال کر سکتا ہے۔ اذیت کو جبلّت کے ساتھ کیسے جوڑا جا سکتا ہے، عورت نہیں جانتی، نہیں جان سکتی۔ عورت ناشائستہ حرکت نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے غصے، انتقام یا انا جیسے منفی جذبوں کو جسم سے کوئی نسبت نہیں اس کے لیے یہ دونوں باب قطبین کی طرح جدا ہیں۔ اس کے لیے رشتے نبھانے کا تصور ممتا پر منحصر ہے۔ انسانیت اور ہمدردی سے جڑا ہے کہ وہ ان سے الگ ہے۔ اس کی انا خون نہیں مانگتی۔ امن مانگتی ہے۔ میرے خیال سے دنیا کا نظم و نسق یا تو عورت کو سونپ دیا جانا چاہیے یا پھر عورت کے مشوروں کے بغیر کسی قسم کی کوئی سیاست نہ کی جائے۔ جب گھر کی سیاست اس کے بغیر ناکام ہو کے رہ جاتی ہے تو ملک و قوم کی اور کرۂ ارض کی سیاست کی باگ ڈور بھی وہ امن سے سنبھال لے گی اور بس اسے پیار کے حربوں سے گمراہ نہ کیا جائے اور اس کی بات بغیر انا کا مسئلہ بنائے مانی جائے کہ اسی میں انسانیت کی بھلائی ہے کیوں کہ زندگی تخلیق کرنے والی کا موت سے کیا واسطہ۔ سو وہی امن کے معاملات سلجھا سکتی ہے۔ میں عراق میں ابوغرائب جیل کی خونی اور گجرات کی حملہ آور عورتوں کی بات نہیں کر رہی کہ وہ یا تو ذہنی مریضائیں ہوں گی یا ان کے پیچھے بھی مرد کی نفسیات کارفرما ہوگی جانے کس طاقت کے زیرِ اثر۔ ایسے ہی جیسے حسد کے مارے سوتیلی ماں ڈائن ہو جاتی ہے۔

خُدا معلوم ہمارے مشرقی کلچر میں صدیوں سے رائج انسانیت کے تئیں دوغلے پن پر مبنی یہ رویہ کب ختم ہوگا۔ وادی کا کلچر ہو، وادی کے اطراف کا ہو، یا وادی سے دُور دُور ریاستوں کا ہو، ہر جگہ یہی نظر آتا ہے کہ عورت ذات اکثر و بیشتر دوسروں کے دلوں کی بھڑاس نکلنے کا آسان ذریعہ بنا کرتی ہے۔ یعنی شوہر اگر بیوی کو بلا سبب ڈانٹ دے تو خود گھر کی بڑی بوڑھیوں کو یہ کہتے ہوے سنا جاتا ہے کہ تم اس کی اپنی ہو وہ تم پر غصہ نہیں اُتارے گا تو کس پر اُتارے گا۔

خالقِ کائنات نے حوّا کی بیٹی کی تخلیق غصہ اُتارنے کے لیے نہیں کی تھی بلکہ خلوص بانٹنے کے لیے کی تھی، نسلِ انسانی کی بقا کے لیے کی تھی، محبت بھری رِفاقت کے لیے کی تھی۔

قاعدے سے شوہروں کی اس لاپرواہ قوم کو باہر کی پریشانیاں گھر کی دہلیز کے باہر ہی چھوڑ دینی چاہئیں۔ غصہ لے کر گھر کے اندر داخل ہونا کہاں کی شرافت ہے۔ اپنی شریک حیات سے اگر غم بانٹنا ہی مقصود ہے تو یہ کام بغیر غصہ کیے نہایت خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوسکتا ہے بلکہ محبت کی بنی اس نازک مخلوق سے خلوص کا رشتہ برتا جائے تو یہ اپنی دور اندیشی اور ذہین مشوروں سے، بیک وقت ایک ہی ڈگر پر سوچنے والی اس مرد ذات کے مسئلوں کا اپنی سوجھ بوجھ سے دیئے گئے مشوروں کے سبب آسان حل پیش کر سکتی ہے۔ تاریخ نے یہ بات بارہا ثابت کر دکھائی ہے کہ مرد کے ہر کامیاب قدم کے پیچھے عورت ذات کا ذہین مشورہ اور مبارک ہاتھ ہوتا ہے۔

خیر! کہنا یہ تھا کہ مثالی خانہ دار، رشتے کے بھائی جان کی مسکراتی رہنے والی بیگم کی پیٹھ پر ایک دن میں نے اچانک تین سیدھے متوازی اور سرخ آبلہ نما نشان دیکھے تھے، وہ گردن پر دوپٹہ برابر کرتی اس وقت بھی مسکرا رہی تھی۔ لکیریں

ڈال دینے والا وہ شدید تھپڑ اگر ذرا اُوپر لگا ہوگا تو گدی پر ضرب پڑنے سے وہ کچھ دیر کے لیے ضرور بے ہوش ہوئی ہوگی۔ ذرا نیچے لگا ہوگا تو پھیپھڑوں اور دل کے عقب میں جھٹکے سے، وہ کتنی ہی دیر تک بے حال اور بے دم ہو کر کھانستی رہی ہوگی۔ اور اگر ذرا زور سے لگ جاتا تو spinal cord کے مجروح ہونے کے سبب وہ ہمیشہ کے لئے اپاہج ہوسکتی تھی۔ پتہ نہیں کتنے وقت تک کسی دیوار یا پردے کی آڑ میں، کسی نیم تاریک کمرے کے زیادہ اندھیارے گوشے میں یہ عمل جاری رہا ہوگا۔ اور وہ باہر نکلی ہوگی تو ایسی مسکراہٹ اوڑھ کر جیسی لیونا ڈو ڈا ونچی نے اپنی شاہ کار تصویر مونا لیزا کے ہونٹوں پر صدیوں پہلے سجائی تھی جسے دیکھ کر کوئی انسان آج تک اپنے ذہن میں اُٹھی ہوئی یہ اُلجھن سُلجھا ہی نہیں پایا کہ آیا اس مسکراہٹ میں سکون چھپا ہے یا درد پوشیدہ ہے۔ یہ مسکراہٹ غم عیاں کرتی ہے یا خوشی۔ یہ مسکراہٹ بات کہہ دینے کے بعد کی ہے یا کوئی راز بیان کر دینے سے پہلے کی۔ اس کا سبب صدیوں سے پتہ نہیں چلا۔

غرض یہ کہ مثالی جوڑے کے بے مثال کامیاب رشتے کا راز بھائی جان کی بیگم کے چپ چاپ ستم سہنے میں پوشیدہ تھا اور اکثر کامیاب جوڑوں کے پیچھے اسی طرح کے اَسرار ہی ہوا کرتے ہیں۔ (ہے نا بڑے رنج کی بات؟)

صنف نازک پر ستم توڑنے کی ان روایات کے بارے میں سوچتی ہوں تو خالص عورتوں کی طرح ظالموں کو باآوازِ بلند کوسنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ سینہ زوری والی نفسیات بدلنے کی فوری ضرورت ہے۔ تشدد کے وقت یہ انا کی ماری مخلوق سوچنا کیوں چھوڑ دیتی ہے۔ مضبوط جسمانی قوت کے مالک کا، اس نازک شے سے کیا مقابلہ۔ اس سے خواہ مخواہ عدم تحفظ کا شکار ہو کر یا اس پر اپنی بہادری کا مظاہرہ کر کے یہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں یہ حضرات؟ اور ان ہاتھوں، لاتوں اور

لکڑیوں سے مارنے والوں کو خیال بھی نہیں آتا کہ معمولی سی ضرب اس نازک اندام ذی روح کے لئے زبردست مصیبت بن سکتی ہے کہ کیا معلوم اس وقت یہ بیٹیاں وقت کی کس جسمانی تبدیلی کے درد سے دوچار ہوں۔ کون جانے یہ بہنیں اپنے اندر ننھی سی کسی جان کی امید باندھے ہوئے ہوں اور کسے خبر کہ یہ مائیں کہ امید کے ماہ وسال تمام ہو جانے کے بعد نسوں کے اندر کے کس تکلیف دہ تغیُّر سے دوچار ہوں، جس میں گاہے منفی صفر درجۂ حرارت میں یہ پسینے میں نہا جاتی ہیں اور جس کو جھیلنے سے ان کی ہڈیاں چڑیوں کی ہڈیوں کی طرح نازک ہو جاتی ہیں اور ہلکی سی چوٹ انہیں بستر سے لگا سکتی ہے جہاں سے پھر اُن کا اُٹھنا چار آدمیوں کے کندھوں پر ہی ہوا کرتا ہے۔

خیر یہ تو تھا معاملے کا سنجیدہ پہلو۔

اور اب بہر حال ان ناعاقبت اندیش قسم کے شوہر حضرات کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ خواتین کے تئیں مسلسل زیادتیاں ان کی اپنی کبر سنی اور ضعیفی میں انہیں بالکل تنہا کر دیں گی۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ ادھیڑ عمر خواتین اپنے شوہروں کی کسی کسی بات کا جواب بے جا غصے سے بھی دیتی ہیں۔ سبب وہی ہوا کرتا ہے۔ جوانی میں بیگم کی بے قدری کرنے کا۔ اور یہ امن پسند مخلوق اُس وقت چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر یا گھر توڑ کر جانے کی بہ نسبت اس تکلیف دہ شب و روز سے سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ مگر درمیانہ عمر میں جب اس کے بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو جوانی بھر دندناتے پھرنے والے شوہر صاحب کو اپنی اوقات کا پتہ چل جاتا ہے کہ پھر ڈانٹ کھانے کی ان کی باری ہوتی ہے۔ جوانی میں تو وہ اپنے گھر والوں سے مل کر یا خود اپنی انا کے سہارے بیوی کی ہر بات میں کیڑے نکالتا رہتا ہے کہ اُس غریب کی طرف سے بولنے والا کوئی ہوتا نہیں اور یہ اپنی جسمانی طاقت اور

شور شرابے کے بل بوتے پر اس پر الزام دھرتا خود کو فاتح سمجھتا ہے۔ مگر کسی دن اچانک قد میں لمبی ہو چکی اس کی اولاد، ماں کی طرف سے سوال کرنے لگتی ہے تو اللہ کے اس گمراہ بندے کو اپنی زیادتیوں کا احساس ہوتا ہے، جب پھر وہ بیگم کی طرف سے چُپ چاپ لعنت ملامت سہہ کر بھی خوش رہتا ہے۔ اب اگر وہ پہلے ہی سے منصف مزاج ہو تو اُسے شرمندگی کے یہ دن کیوں دیکھنا پڑیں۔ شریکِ حیات سے حریفانہ برتاؤ کہاں کا چلن ہے۔ غم گُسار کو غمزدہ رکھنا کہاں کی شرافت ہے اور دوست پر دھونس جمانا، چہ معنیٰ دارد۔۔۔؟

اجنبی جزیروں میں

دنیا میں اگر کہیں پانچ سوتہتر (۵۷۳) کے قریب مختلف رقبوں کے جزائر ہلکے نیلے، گہرے نیلے، سیاہی مائل نیلے، سبزی مائل نیلے، فیروزی نیلے یا آسمان اور سیماب رنگ پانیوں کے درمیان نیلم کے ہار میں پنّے کے نگینے سے جڑے، پانیوں پر بکھرے ہوں تو آپ کی نظر سراپا سپاس ہو جائے گی کہ آپ نے کیسے کیسے کرشمے اس کے سامنے کر دئے اور آپ کا دل قدرت کے روبرو سجدہ ریز رہے گا۔

گزشتہ برس اینڈین رائٹرس فیسٹیول کے لئے اردو کی طرف سے کینڈا جانے کا اتفاق ہوا تو سفر کے دوران کچھ مقامات کی سیر کرنا بھی طے تھا۔ ایک ناؤ ہمیں امریکہ اور کینیڈا کی درمیانی سرحد کے پانیوں پر جھلاتی الگ الگ جزیروں کے نظارے کرواتی متحیر کئے دے رہی تھی۔ منظر اس قدر حسین تھا کہ موبائل فون سے کھنچی تصاویر پر ہمیں کسی ماہر فوٹوگرافر کے شاہکاروں کا گماں ہوتا تھا۔ بعض جزیروں پر قطر کے حساب سے مناسب جسامت کی حسین تعمیرات بھی نظر آئیں۔ نگاہیں نظارہ کئے نہ تھکتی تھیں اور ہاتھ تصویر اتارنے میں اتنے مصروف کہ دل ایک خوبصورتی جذب بھی نہ کرنے پاتا تھا کہ دوسرا منظر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ سامنے آن موجود ہوتا۔

یاد آتا ہے کہ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ایک خبر پر گھر کے افراد سے لے کر ملازمین تک کے درمیان بحثیں ہوا کرتیں تھیں۔ خبر یہ تھی کسی سیاح نے ہماری وادیٔ کشمیر کے حسن سے متاثر ہو کر خودکشی نامے میں وجہ یہ درج کی تھی کہ مرنے کے لیے اُسے اِس سے حسین جگہ کبھی نہ نظر آئے گی۔ خود ہم بھی سوچتے ہیں کہ کیا تکمیل کی صفر آغاز سے پہلے کی ہی صفر کے برابر نہیں ہوتی؟ تو پھر جینے مرنے کا کیا جھگڑا؟ بات محض قلب و روح کے سکون کی ہی تو ہے اور موت ہے کہ اٹل۔ یعنی یوں ہوا کہ قدرت کے اس کراماتی حسن میں غرق ہو جانے کا خیال بھی آتا رہا اور ساتھ ہی اس طرزِ حفاظت کے لئے زبان پر کلماتِ تحسین بھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے ان سارے خیالات پر ایک تلخ حقیقت غالب آ گئی کہ خدا معلوم، ستم پیشہ قفقازوں نے اپنی پسند کی زندگی بسانے کے لیے کتنے ہی مقامی باشندوں کا استعمال اور استحصال کیا ہوگا اور کتنوں کی بلی چڑھائی ہوگی کہ حسبِ عادت وہ صدیوں سے دوسری اقوام کو نیست و نابود کرتے اور حسبِ دستور بچے ہوؤں کو غلام بناتے، اپنی دنیائیں سجاتے رہے ہیں اور اب بھی اسی کام سے نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ وابستہ ہیں گویا ان کے لئے تہذیب کے معنیٰ کچھ دوسرے ہی ہیں۔

کالے پانی کہلانے والے انڈیمان نیکوبار، جزائرِ خلیج بنگال میں واقع ہیں اور تعداد میں پانچ سو تہتر کے قریب ہیں جن میں صرف سینتیس پر ہی انسانی آبادی ہے جو تقریباً پانچ لاکھ ہے۔ قدیم زمانے سے ہندوستان اور برما کے درمیان تجارت اسی راستے سے ہوتی رہی مگر صدیوں پہلے سے وہاں جو قبائل آباد تھے انہیں چھوڑ کر عام انسان کے لیے وہاں سکونت اختیار کرنا تقریباً ناممکن تھا کیونکہ جنگل ہی جنگل تھے اور قریب قریب سال بھر ہی بارشیں ہوتی رہتیں، پھر

قابلِ رہائش زمین بھی برائے نام تھی۔ وہاں کے باشندے حتیٰ المقدور باہر کے حملہ آوروں کو روکتے رہے مگر بالآخر انہیں ہتھیاروں کے آگے پسپا ہو کر سمٹنا پڑا۔ بہت عرصے تک وہ لوگ آگ تک جلانا نہیں جانتے تھے نہ اس کے استعمال سے ہی واقف تھے۔ انسانی تہذیب کے وسطی دور میں انڈمان نکوبار جزائر سمندری ہجرتوں کے اہم مقامات تھے۔ لوگ دور دراز خطوں سے آ کر وہاں آباد ہوتے تھے۔ یعنی افریقی ملکوں سے بحیرۂ عرب کے راستے اور جنوب مشرق ایشیا، جاپان وغیرہ سے مگر اس کے بعد سے تقریباً اٹھارویں صدی عیسوی تک یہ لوگ الگ تھلگ رہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ انڈمان کا مطلب سونے کا جزیرہ ہے اور ایک خیال کے مطابق وہاں کی قدیم زبان 'ملائے' میں انڈمان بھگوان ہنومان کو کہا جاتا ہے۔ مشہور ہیئت دان بیطلیموس نے بھی اس مقام کا ذکر کیا ہے مگر کسی دوسرے نام سے یعنی نام بدلتے رہے ہوں گے۔ کسی سفرنامے میں ایک نام تحریر ہے تو کسی میں دوسرا۔

سن اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) میں آزادی کی پہلی جنگ کے قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے نت نئے طریقوں کے موجد انگریز نے سوچا کہ قیدیوں کا استعمال جزائر کو قابلِ رہائش بنانے کے لئے کیا جائے کیونکہ گھنے جنگلوں، زہریلے کیڑوں اور دلدلوں والے اس خطے میں جان کے لیے خطرے ہی خطرے تھے مگر جان چونکہ انگریز کی نہ ہو کر ہندوستانیوں کی تھی اس لیے وطن سے محبت کرنے والے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے لوگ ایک جگہ اکٹھے کیے گئے اور ایک ہی طرز کی جہنم نما زندگی گزارنا ان کا مقدر ہو گیا۔ وہ جنگل اور پہاڑ کاٹتے، دشوار گزار راہوں پر پھسلتے، کھائیوں میں سے دلدل میں گری لکڑیاں نکالتے سانپوں اور کیڑوں سے ڈسے جاتے، دلدل میں گرتے اور وہیں دھنس

جاتے۔ (جیسے میری وادیٔ کشمیر کے باشندے مہاراجہ کے دور میں فوج کا سامان منگوانے کے لیے گلگت بھیجے جاتے تھے اور سخت سردی اور دشوار گزار درّوں کی نشیبی کھائیوں میں گر کر کبھی گھر نہیں لوٹتے تھے، جسے مورّخ گلگت بیگار کے نام سے لکھتا ہے کہ اس جان لیوا کام کے لئے یہی نام رائج تھا۔) دلدلوں کے ان ہی زندہ مقابر پر سڑکیں تعمیر ہوئیں اور انہی میں سے کچھ سزا کاٹ کر بچ جانے والوں کی نسلیں وہاں آباد ہوئیں اور کچھ آزادی کی تقریباً ڈیڑھ دہائی بعد خطے کی ترقی کی غرض سے وہاں بسائے گئے۔ کچھ ہندوستان کے دوسرے مقامات جیسے تامل ناڈ، کیرل، بنگال وغیرہ سے بھی پانی کے راستے وہاں آ کر بستے گئے۔

ایک بات جو انڈیمان نکوبار جزائر کی خاصیت ہے وہ وہاں کی مذہبی رواداری اور بھائی چارہ ہے کہ کوئی مذہبی پیشوا آپ کو گمراہ کر کے سیاست دانوں کا بھلا کرنے کے لئے اُتھارِٹی بنا ہوا نہیں ملے گا۔ ایک ہی احاطے میں مسجد، گرجا گھر اور مندر تعمیر ہیں۔ آبادی کم ہونے کے سبب لوگ آپس میں رشتے داریاں قائم کیے ہوئے ہیں کہ اگر بہو عیسائی ہے تو داماد مسلمان، جٹھانی ہندو ہے تو دیورانی عیسائی۔ ایسا ہی کچھ لداخ کے خطے میں بھی ہے۔

انڈیمان نکوبار جزائر فی الحال کئی طرح کی آلودگیوں سے کافی حد تک پاک ہیں مگر بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ پہلے کی نسبت ہوا آلودہ ہو گئی ہے کیونکہ ٹریفک کا غلبہ ہوا چاہتا ہے۔

سمندر کے بیچ محدّب شیشوں کے فرش والی ناؤ میں سیر کرنے کے لیے جانے کے زمینی راستوں کے اطراف ناریل اور سپاری کے باغات ہیں۔ دونوں درخت کچھ ایک سی صورت کے ہیں۔ ناریل کے درختوں کے تنے بڑے اور اونچائی کم ہے اور سپاری کے پتلے اور اونچے درخت ہیں۔ دونوں میں پھل

اونچائی پر گچھوں کی شکل میں لگتے ہیں مگر پھلوں کی جسامت اور رنگ جدا ہیں
چوں کہ ناریل تو ناریل ہے اور سپاری چھوٹی سی۔ باقی سامانِ خوردنی دوسری
ریاستوں سے وہاں جاتا ہے کیونکہ ادھر کچھ زیادہ کاشت نہیں ہوتی۔ سڑک کے
کنارے لوگ سپاری کو چادروں پر بچھائے سکھاتے نظر آتے ہیں جو سوکھنے
پر سرخ رنگ چھوڑ کر بھوری ہو جاتی ہیں۔ یہاں سے سپاری پورے ہندوستان اور
دوسری جگہوں کو جاتی ہے۔ محدّب شیشے کے نیچے نیچے سمندر کی اندرونی دنیا بڑی
واضح اور قریب ہو جاتی ہے۔ ہر رنگ اور ساخت کی مچھلیاں اور کئی طرح کے
ساحلی مرجان نظر آتے ہیں اور کئی اور سمندری جاندار اور بے جان اشیا بھی۔
ناؤ پورٹ بلیئر کے ایک چھوٹے سے جزیرے 'جولی بوائے' کے ساحل پر رکی تو
دیکھا کہ پانی کئی رنگوں کی لہریں بناتا بہتا تھا، غالباً اس طرح تہہ کے معدنیات
اور اطراف اور آسمان کے رنگ کے سبب ہوتا ہے۔ ایسا منظر پہلے کسی ساحل پر
کبھی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ ازل کی صفر سے عدم کی صفر کا رہ رہ کے خیال آتا تھا
مگر یہ سکون کی انتہا تھی اور مثبت ہی مثبت تھی۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝

☆☆

'اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند'

تہوار اگر انسانی تہذیب سے نہ جڑے ہوں تو شب و روز کی یکسانیت زندگی کو پھیکا کرنے پر یقیناً قادر ہو جائے کہ کسی نامعلوم شئے کے خوف یا شوق میں خیال کی رفتار پر بھاگتی اس دنیا میں ذرا دیر کا ٹھہر جانا ایک عیاشی کی طرح ہی معلوم ہوتا ہے۔ کچھ دن پہلے ہندوستان کے بہت سے حصوں میں دیوالی کا تہوار ہمیشہ کی طرح رنگولیوں، چراغوں، اور آتش بازیوں اور پوجا ارچنا کے ساتھ منایا گیا۔ بغیر ڈھکے فرش پر کئی رنگوں سے بنائی رنگولیوں پر اگر آپ کی نظر اچانک پڑ جائے تو آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ قالین بچھا ہے۔ کتنے ہی رنگوں اور نقشوں والے قالین۔ کہیں پھول، پتیاں، بیلیں، کہیں گھڑے، گھڑونچیاں، چراغ دان، گھر اور مختلف چیزوں کی شبیہات۔

راجہ دشرتھ کی چار رانیوں میں سے رانی کوشلیا کے بیٹے اور بڑا ہونے کے ناطے تخت کے وارث رام چندر جی کو راجہ کی طرف سے رانی کیکئی کو دیا گیا ایک وچن نبھانے کے لئے جنگل میں سکونت کا حکم ملا تو ان کے ساتھ ان کی جیون سنگنی سیتا اور بھائی لکشمن بھی بن کو سِدھارے۔ ان ۱۴ برسوں میں انہوں نے جو صعوبتیں سہیں وہ رامائن میں درج ہیں۔ لنکا کے راجہ راون نے اپنی بہن سروپ

نکھا کی ناک، لکشمن کے ہاتھوں قلم کر لیے جانے کے بعد بدلے کے طور پر سیتا کو اغوا کر لیا تھا۔ فلم اور سٹیج پر اور رام لیلا کی عوامی سطح کی نمائشوں میں، شوہر پر نثار ہونے والی سیتا کا راون کے برہمن کے بھیس سے دھوکا کھا کر بھکشا دینے کے لئے لکھشمن ریکھا پار کرنا، اپنی آزادی کی مسلسل جدوجہد، وانر سینا یعنی بندروں کی فوج کا رام جی کے ساتھ مل کر راون کی لنکا پر دھاوا بولنا، پرندے جٹائیو کا رول اور اس سے جُڑے سارے سلسلے کے مختلف کرداروں کی ادائیگی نہایت دلچسپ ہوا کرتی ہے۔

رِوایت ہے کہ ایک عالم برہمن کے بیٹے راون میں خود بھی ایسی کئی شکتیاں تھیں جو گھور تپسّیا کے بعد حاصل ہوئی تھیں۔ اس کے ۱۰ سر، اس کی ۱۰ انسانی خصوصیات کا استعارہ بتائی جاتی ہیں اور جنوبی ہند میں کئی جگہوں پر راون کی پُوجا ہوتی ہے۔ کئی مقامات اس کے نام سے منسوب ہیں جیسے راون نگر، راون چوک وغیرہ۔ کہتے ہیں کہ میرٹھ کے اطراف راکھشسوں کی بستی کے راجہ، مایاسُر نے لنکا کے اس برہمن کے ہونہار بیٹے کو اپنا داماد بنانا چاہا۔ مایاسُر نے مایا راشٹر (جو آنے والے زمانے کا میرٹھ تھا) بسایا تھا مگر اس کے بارے میں بھی بہت سے اختلافات ہیں۔ جاٹ کہتے ہیں کہ یہ شہر ان کے اجداد نے بسایا ہے۔ کھدائی سے دریافت ہوئے بودھ آثار کچھ اور بتاتے ہیں۔ مایاسُر یعنی راکھشسوں کا راجہ خود بھی ایک برہمن تھا اور یہ قبیلہ غالباً جڑی بوٹیوں اور منتر تنتر سے علاج کرنے والا رہا ہوگا کیونکہ ان سے کئی طرح کی طاقتیں منسوب بتائی جاتی ہیں۔ مایاسُر نے اپنی بیٹی مندودری کو راون سے بیاہ دیا۔ مندودری راون کی کئی بیویوں میں اپنی خوبیوں کے باعث اہم مقام رکھتی تھی۔

بھگوان رام جب راون سینا کو ہرا کر اور راون کا وَدھ یعنی قتل کر کے

سیتا میا اور لکشمن کے ساتھ لوٹے تو چراغاں کیا گیا اور خوشیاں منائی گئیں۔ وجے دشمی یعنی فتح کے دسویں دن یا دسہرے کے تہوار پر راون اور اس کے بھائی کنبھ کرن اور بیٹے میگھناد کے پتلے جلائے جاتے ہیں اور پھر کوئی بیس روز بعد کارتک مہینے کے پندھرواڑے میں، اماوس کی اندھیری رات کو روشنیوں کا یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ یہ دن اکتوبر نومبر میں آیا کرتا ہے۔ رام تخت نشین ہوئے تو انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے راج پاٹ سنبھالا۔ رام راجیہ کی مثالیں ابھی بھی دی جاتی ہیں کہ وہ دور ہر اعتبار سے رعایا کے سُکھ کا دور تھا جو پھر کبھی میسّر نہیں ہوا۔

گیارہوں صدی تک کوئی رام مندر نہ ہوتے تھے۔ رام چندر جی کو انسان کی طرح ہی دیکھا جاتا تھا۔ رام بھگتی کے گیت سولہویں صدی میں گائے جانے لگے تھے۔ رام جی مریادہ پرشواُتّم یعنی ایک مثالی انسان کے طور پر جانے گئے اور بھگوان کہلائے۔ رام ہندو مت کے اہم ترین دیوتاؤں میں سے ہیں اور ان کے بچپن یعنی رام للہ کی شبیہہ کی بھی پرستش ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال کہہ گئے ہیں کہ

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

کہتے ہیں دیوی لکشمی، سیتا کا روپ لے کر اپنے پتی، وشنو کے رام چندر جی کی شکل میں نئے جنم کا ساتھ پانے کے لئے بھومی یعنی زمین سے پیدا ہوئی تھیں۔ مریادا پرشوتم رام نے ایک دھوبی کو بیوی سے جھگڑتے وقت ایک جملہ کہتے سنا کہ "میں رام نہیں جو کسی اور کے وہاں سے لوٹی بیوی کو معاف کر دوں"، اور سیتا میا سے، جو اس وقت ان کے بچوں، لَو اور کُش کی امید سے تھیں، کنارہ کر لیا۔ مگر جس سیتا میاؔ نے محل کے سکھ تیاگ کر پتی کے ساتھ رہنے کے لئے بن باس

یعنی جنگل میں بسیرا کرنا منتخب کیا، اسی سیتا میّا کو اپنی پوترتا یعنی پاکدامنی ثابت کرنے کے لیے اگنی پریکھشا دینی پڑی۔ یعنی سلگتے انگاروں سے گزرنا پڑا اور آگ انہیں چھو بھی نہ سکی۔ مگر پھر بھی ان کے دکھوں کا خاتمہ نہیں ہوا۔ اس پر سیتا میّا نے واپس اپنی جنم بھومی میں سمانے کی پرارتھنا کی۔ دھرتی ماتا کی چھاتی پھٹ گئی اور سیتا میّا واپس اس میں سما گئیں۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی کتنی ہی سیتائیں جانے کن اصولوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں اور ان کی ماؤں کا سینہ بھی ایسے ہی شق ہو جاتا ہے۔ کبھی انا کی تسکین کے لیے، کبھی جہیز کی خاطر، کبھی شکوک وشبہات کی بنا پر کبھی کسی اور بہانے سے۔ گویا خوشی کی تقریبات کے ساتھ کہیں نہ کہیں غم بھی آ کر جڑ جاتا ہے۔ زمانوں سے یہی ہوتا آیا ہے اور خدا معلوم کب تک ہوتا رہے گا۔

اللہ میاں کا انصاف اور فوجداری فیصلے

اللہ میاں کسی گناہ گار کو سزا دینے میں کبھی کبھار یا تو اس لیے دیر کرتے ہیں کہ شاید وہ سدھر جائے اور اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے اچھے کام کرے یا پھر اس لیے بھی کہ گناہ گار گناہوں کی حد کو پار کر لے تو وہ اسے اس کی منزل دکھا دیں۔ ظاہر ہے کہ سزا کا تعین بھی گناہوں کے حساب سے ہی ہوتا ہے۔ جس خطا کار سے اللہ میاں کو سدھرنے کی امید ہو وہ اسے ہاتھ کے ہاتھ قدرے کم درجے کی سزا دے کر متنبّہ کرتے ہیں۔ مگر دوسری قسم کے فاسق کو لمبی ڈھیل دے کر پہلی اور آخری بار اپنے قہّار ہونے کی جھلک بھی دکھلا دیتے ہیں۔

اللہ میاں کی کوئی بات بغیر جواز کے نہیں ہو سکتی۔

لیکن اپنے پسندیدہ موضوع پرندوں کے معاملات کو لے کر سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ ایسی چڑیا کو اللہ میاں نے دو پاؤں کیوں عطا کیے ہیں جو فاختہ یا مینا کی طرح چلتی نہ ہو بلکہ گوریّا کی طرح صرف اچھلتی ہو کہ اُچھلنے کے لیے تو ایک ہی پاؤں کافی ہے۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ اس کے ننھے سے جسم کا توازن قائم رکھنے کے لیے بھی ایسا ضروری ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ اس کام کے لئے اسے ایک قدرے چوڑا پیر بھی عطا کیا جا سکتا تھا۔ بحر حال!

اللہ میاں کی باتیں اللہ میاں ہی جانیں۔ کیا معلوم کہ اس کے پیچھے کیا کیا حقیقتیں پوشیدہ ہوں، جدھر بندے کا تخیل جانے کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو۔ کیوں کہ اس طرح کی کتنی ہی مخلوقات کے ہونے کا جواز انسانی عقل سے بعید ہوا کرتا ہے۔

مثال کے طور پر اللہ میاں نے آخر اس دنیا کے اندر یہ ظالم اور سادیت پسند لوگ کیوں پیدا کیے ہیں۔ شاید اس لیے کہ جب انہیں سزا ملے تو ان کا انجام دیکھ کر باقی لوگ سبق حاصل کریں۔ مگر انہیں سزا ملے گی کب، کیونکہ وہاں اندھیر تو ہے نہیں۔

اسی طرح دنیا وی انصاف کے تعلق سے میری سمجھ میں فوجداری مقدموں کا بھی کوئی جواز نہیں آتا کہ ایک پوری نسل ہی عدالت کے فیصلے کے انتظار میں ختم ہو چکتی ہے۔ ۳۰۷، ۳۲۵، ۳۹۵ جیسی دفعات کے علاوہ، ۳۰۲ جیسی دفعہ کے تحت آنے والے جرائم کا فیصلہ تو قاعدے سے جلد از جلد منظرِ عام پر آ جانا چاہیے کہ یہ مدعی اور ملزم دونوں کے لئے ضروری ہے۔ اوّل الذکر کے سکون کے لیے اور موٴخر الذکر کی عبرت ناک مثال قائم کرنے کی خاطر کہ اب پرانے زمانے کی طرح ثبوت کا فقدان نہیں ہوا کرتا۔ فنگر پرنٹس، سنفر ڈاگز، پوسٹ مارٹم، یہاں تک کہ ڈی این اے ٹیسٹ تک دستیاب ہے جو مسائل کو قلیل ترین عرصے میں حل کرنے میں معجزاتی رفتار سے مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ تو پھر یہ برسوں اور دہائیوں پر مشتمل جان لیوا وقفے، چہ معنیٰ دارد؟

سن انیس سو چوراسی (۱۹۸۴ء) کے فسادات والے مقدموں کے فیصلوں کی طوالت اس بات کی زندہ مثال ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک الگ باب ہے کہ فوجداری فیصلے نقصان کی تلافی کرنے میں کس حد تک منصفانہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی اب تحقیق کی اور پھر ترمیم کی خاصی گنجائش پیدا ہو چکی ہے۔ انصاف کے فیصلے کا انتظار بھی لواحقین کے لئے جان لینے جیسا ہو جاتا

ہے۔ اور اس بات کی مثال بھی سن چوراسی ہی کے فیصلوں سے لی جاسکتی ہے۔ اب جبکہ مقدموں کا انجام ایسا ہوتا ہو، تو قانون پر کس حد تک اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو ثابت ہوا کہ ہم لاقانونیت کے دور میں جی رہے ہیں۔

کچھ اور تازہ مثالوں کے طور پر حالیہ خبروں سے ایک مثال حاضر ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے بعض 'امن دشمن' گرفتاریوں کے تعلق سے کئی خبریں میڈیا میں سرخیاں بنی ہوئی ہیں۔ اصل میں ان تازہ خبروں کا تعلق بھی ایک قدرے پرانی خبر سے ہے جس کی کڑیاں برسوں سے ہوتی ہوئی جا کر دہائیوں سے مل جاتی ہیں۔ حالیہ خبروں میں، قومی اخباروں کے صفحۂ اول پر ایک نمایاں خبر دیکھی تھی کہ بعض 'ملک دشمن عناصر' کو ایک خفیہ اڈے سے رنگے ہاتھوں میٹنگیں کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ ان کے پاس سے اردو رسمِ خط میں خفیہ دستاویزات بھی برآمد ہوئیں اور اُس مقام پر حیرت انگیز طور پر پاکستان کا جھنڈا تک لہرا رہا تھا۔

اب جہاں عام آدمی کی معصومیت کے لئے یہ خبر سنسنی خیز اور پولیس کی بہادری اور چوکنے پن کی مثال بن کر، نئی خبروں کی تشنگی کی تسکین کا سامان ہوئی، وہیں سوچنے والے اذہان کے لیے اس کا تعجب خیز ثابت ہونا بھی ناگزیر ہو گیا۔

ماہِ نو اور ستارے والا ہرے رنگ کا جھنڈا جس جگہ لہرا رہا تھا وہ ایک درگاہ تھی اور یہ سارا جہاں جانتا ہے کہ درگاہوں پر ایسی ہی جھنڈیاں لہرایا کرتی ہیں۔ ہلال صدیوں سے مسلمانوں کی شناخت کا استعارہ رہا ہے اور بیشتر اسلامی ملکوں میں قومی پرچم پر چاند اور ستارا پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر الجزائر کے ہلال کا ایک ستارا، ترکمانستان کے چاند کے ساتھ پانچ ستارے، ازبکستان کے ماہِ نو کے ہمراہ بارہ تارے، یا ملیشیا، مالدیوس، ترکی، پاکستان وغیرہ کے پرچم میں ہلال کے ساتھ کئی کئی ستارے جو نیلے، پیلے، سرخ، ہرے، سفید، سبز، نارنجی اور

ہمہ رنگ شکل اور تعداد میں ہوتے ہیں۔

یہ تو تھا خفیہ اڈے پر پاکستان جھنڈے کے لہرانے کا معاملہ۔

دوسری بات یہ کہ اکثر درگاہوں سے مسجدیں منسلک ہوا کرتی ہیں۔ جہاں بچوں کو قرآنِ حکیم اور زبانِ اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ایسے مقام میں کسی معلم کے سر پر ٹوپی اور چہرے پر داڑھی ہونا منفی کیسے ہوسکتا ہے۔بچے بغدادی قاعدے سے کون سا خفیہ لٹریچر پڑھا کرتے ہیں۔اُن ستم رسیدہ کے کنبے تو شکار ہوئے ہی، ذرا اندازہ لگائیے اس بلائے ناگہانی کا، جب وردی والے بچوں کے درمیان سے ان کے استاد کو زدوکوب کرتے ہوئے گرفتار کر کے لے گئے ہوں گے تو ان کی معصوم نفسیات پر کیا اثر پڑا ہوگا۔

آزادی کے ساٹھ ایک برسوں میں یہ ثابت ہوگیا ہے کہ وہ مسلمان، جنھوں نے اپنی مرضی سے اپنا وطن، ''سارے جہاں سے اچھا'' اپنا ہندوستان منتخب کیا، کس طرح اجنبیت کا زہر پیتے ہیں، غیریت کے طنز سے نوازے جاتے ہیں اور قدم قدم پر دُشنام طرازی کے شکار ہوا کرتے ہیں۔

کس طرح اہلِ غرض نے پہلے ان 'ملیچھوں' کو منصوبہ بند طریقے سے تعلیم کی سہولیات سے محروم رکھا اور پھر جہالت کا الزام لگا کر ان پر اعلیٰ عہدوں کے دروازے بند رکھنے کا جواز پیدا کرتے گئے۔اب جہاں کہیں بھی ان کی تعلیمی شرح کچھ بہتر نظر آنے لگتی ہے، انھیں تباہ کرنے کے نت نئے منصوبوں پر عمل ہونے لگتا ہے۔ گجرات کا مسلمان تاجر طبقہ اس سے کس درجہ دوچار ہوتا رہا ہے، کُل عالم پر واضح ہو چکا ہے۔اور کمزور، یعنی دیدہ و دانستہ کمزور بنایا گیا طبقہ مسلسل عتاب کا شکار ہے۔جس خطے میں ان کی تہذیبی جڑیں کسی حد تک محفوظ ہیں اور وہ اپنی نسلوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرتے معلوم ہوتے ہیں، وہیں سکون کے دشمنوں

کی زبان میں یہ ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ گنے جاتے ہیں۔ یعنی مندر پر مثلاً حملہ ہوتو اس میں کوئی سیاسی چال نہیں، کوئی سادیت پرست ذہن نہیں، یا کوئی غیر انسانی سوچ والا عنصر نہیں، بلکہ مسلمان ملوث نظر آتا ہے اور اگر عیدگاہ کی نماز اور جمعہ کے خطبے کے دوران بم دھماکے ہوں تو بھی اس کی ذمہ داری مسلمان پر ہی عائد ہوتی ہے۔ مالیگاؤں اور حیدر آباد جیسے واقعات اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

گوکہ پہلے کی نسبت ہر شعبے کی طرح حفاظتی نظام میں بھی تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے نوجوانوں کی موجودگی، بعض اوقات اپنی غیر جانبدارانہ اپروچ کا پتہ دیتی رہتی ہے، اور دے گی کہ نئی نسل بڑے حوصلہ افزا انداز میں اپنے اندر منصفانہ مزاج رکھتی ہے۔ مگر اس میں خدا معلوم کتنا وقت اور درکار ہوگا۔ لیکن اس وقت تک اپنی سی کرنے والے اپنی سی ہی کریں گے کہ اب بھی ان خود ساختہ مُنصِفین کو پندرہ سے پچپن کے بیچ کا کوئی بھی مسلمان نہایت آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے۔ کہ جناب، تو خاکی رنگ آقا ہیں اور اگر آپ کی پشت پناہی پر کنول اور کیسریا رنگ کی طاقتیں موجود ہیں تو ثبوت مانگے گا کون۔ آپ کا جب جی چاہے آپ کسی بھی شہر، قصبے یا پچھڑے گاؤں میں گھس جایئے۔ وہاں کسی درگاہ پر ہرے رنگ کا پرچم، ہلال کی شبیہ لیے لہراتا نظر آئے تو بس آپ کا کام ہو گیا کہ وہیں یہ 'آتنک وادی' آسانی سے مل جاتا ہے۔ آپ کی گاڑی میں احتیاطاً، ان ہی مشکل گھڑیوں کے لئے سنبھال کر رکھا گیا آتش گیر مادّہ تو ہوتا ہی ہے۔ اندھیرے میں وہاں رکھوا دیجئے اور دن کی روشنی میں اپنے جیالوں کی ٹیم اور شامہ میں مستعد کتّوں کے ساتھ وہاں سے برآمد کر لیجیے۔ نوجوانوں کو گاڑیوں میں ٹھونس لے جایئے کہ آپ کی جیلوں میں بڑی جگہ ہے۔ بھلے ہی وہ سڑکوں کے نیچے بچھے مین ہول کی صورت پیش کرتی ہوں۔ لیکن ایسا بھی زیادہ دیر تک نہیں

چلے گا کہ دیانتدار قسم کی صحافت نے عوام کے سامنے سچائیاں کھول دی ہیں اور ذمہ دار افسران بھی گاہے بہ گاہے خبر لینے لگے ہیں، مگر اس کے باوجود مقابلہ کڑا ہے کہ سچ کی جیت ہوتے ہوتے ہی ہوتی ہے۔

گلاب رُو نیلوفر اور شفق گوں زعفران تو رشیوں منیوں اور پیروں صوفیوں والی میری وادی کی ہزاروں برس پرانی تاریخ اور تہذیب سے متعلق جھیلوں کے پانیوں اور ٹیلوں کے مرغ زاروں کے مظہر ہیں۔ مگر اب گویا ان کے معنیٰ ہی بدل گئے ہوں۔ کہاں پھولوں اور پتیوں کی نرمیاں، کہاں سنگدلانہ غیر انسانی اطوار۔ دل دُکھنے لگتا ہے سوچ کر، ہر ذی حس کا دُکھتا ہوگا۔ اپنی غیر جمہوری سیاست کا کچھ اور نام، کوئی دوسرا نشان رکھ لیتے اہلِ غرض۔

بہت ترقی کی ہے انسان نے، سائنس کے علوم میں، نفسیات کی تہ در تہ معنویت جاننے میں کہ آپ کے پاس سچ اگلوانے کے ہتھیار تو ہیں ہی جھوٹ قبول کروانے کے ہتھکنڈے بھی ہیں۔ مگر یہ تصویریں جو بیسیوں کے حساب سے۔ آپ بغیر حقیقی ثبوت کے میڈیا کو سونپتے ہیں، کبھی فرصت کے لمحوں میں ان کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کریں گے تو شاید ان کی سوئی تقدیروں کی طرح خفتہ، آپ کا ضمیر بیدار ہو جائے کہ یا تو کسی چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں جو پتھر سا ہو کر کیمرے کو دیکھ رہا ہے اور یا کوئی لاچار اچانک غیر یقینی ہونے والے مستقبل پر حیراں ہے، اس لیے کہ کہیں آپ نے تعلیم کے لئے دوسرے نگر جاتے طالبِ علم کو دھر لیا، تو کہیں اپنے گمشدہ عزیز کی تلاش میں دیارِ غیر کی جانب نکل پڑے انسان کے ہاتھوں میں زنجیریں ڈال دیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ کو اپنے علاقے کے بازار سے سبزی خریدتے، ٹیوشن سے لوٹتے، یا دیوار، درخت یا ستون سے لگے آدمی میں بھی اس کے دہشت گرد ہونے کے واضح ثبوت

نظر آتے ہیں۔ پھر آپ کی سلاخوں کے پیچھے کون جان سکا ہے کہ کس کے ساتھ کیا
کیا ہوا کرتا ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ایسے بے نشاں ہو کر لا پتہ ہوتے
ہیں جیسے کبھی موجود ہی نہ تھے۔

لیکن یہ بھی اب کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں ہے کہ یہ خبریں صرف خبریں
نہیں رہی ہیں، یہ منظم سازشوں کی ایک کڑی ہے کہ اب عورتوں اور بچوں کو بھی
مجرم گردانا جانے لگا ہے۔ اور اب یہ کم نصیب ہر اس جگہ پر بڑی تعداد میں پائے
جانے لگیں گے جہاں ان کی بستیاں اور گاؤں ہوں گے۔ غیر تعلیم یافتہ
بے روزگاروں کو تو شکوک کے پیشِ نظر گرفتار کر کے کوئی ٹھوس ثبوت عوام کے
سامنے پیش نہیں کیا گیا، اور اب یہ نئی سنسنی پھیلانے کے لیے تعلیم یافتہ طبقے
پر دھڑ ادھڑ الزام دھرتے جا رہے ہیں۔ کسی پر بم بنانے کا، تو کسی پر منصوبہ بنانے کا۔

یہ غیر جمہوری زہر بونے والے گل چیں، اپنے نام لیوا تو چھوڑ کر ہی
جائیں گے، مگر ان کے گناہوں کو عیاں کرنے والے انہی کے ہم مذہب بھی اس
سرزمین پر ان سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ جبھی تو مجروح ہوتی ہوئی
جمہوریت کسی نہ کسی طرح بچ نکلتی ہے۔ اور ایک دن ایسی طاقتوں کی انسان دوستی
شاید ان زہریلے دماغوں میں محبت بھرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اب رہی
بات عالمی پیمانے پُر امن پسند اذہان کے تناسب کی، تو میں اس پر بھی مثبت
انداز سے سوچتی ہوں کہ لوبان کا ننھا سا ٹکڑا یا نازک سی ایک اگربتی دور دور تک
مہک بکھیر دیتی ہے۔ معطر سوچوں والے انسان فیصلہ لے لیں تو انسانیت کی
خوشبوئیں عالم بھر میں بکھر جائیں گی، بس اگربتی روشن کرنے کی دیر ہے۔

☆☆

بارگاہِ دانش میں

احمد آباد کے ہوائی اڈے کے گیٹ نمبر ایک کے قریب بیٹھی دلّی کی فلائٹ کی منتظر میں بہت دیر سے کئی ملی جلی ذہنی کیفیات سے دوچار تھی جن میں مسرت بھی، اداسی بھی اور حیرت بھی تھی۔اصل میں ایک منفرد قسم کا سیمینار یہاں منعقد ہوا جو صرف اور صرف کسی کی ادبی خدمات اور انسان دوستی کے سبب تھا کہ اس میں شریک ہونے والوں کو کسی قسم کی ترقی کی ہی توقع تھی نہ پذیرائی کا جُنون۔کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ صاحبِ مجلس کوئی اہم عہدہ ہی سنبھالے بیٹھے ہیں اور نہ کسی ادبی 'گروہ' کے سربراہ ہیں۔وہ تو بس ایک ایسے استاد ہیں جنہیں ادب کے سارے علوم اَزبر ہیں اور ان سے دوسروں کو مستفید کرنے کا شوق۔عبادت کی حدود کو چھوتا ہوا شوق، اور ان کے پرستاروں کو بھی محض محبت کے بل پر ادھر آنا تھا کہ کوئی ان کے پیر چھو رہا تھا، کوئی ہاتھوں کو چوم رہا تھا۔ان کے ایک ایک لفظ پر فدا، بیٹھے سامعین اپنی نشستوں پر سے ایستادہ ہو کر ان کی تعظیم کر رہے تھے اور وہ اپنی طبیعت کی خرابیاں بھول کر ان کے ہر سوال کا مفصل و مدلل جواب دیتے خود بھی محظوظ ہوتے تھے۔لوگ گاہے نم نم آنکھوں سے انہیں نہارتے کہ کہیں یہ خزینۂ علم و ادب اُن سے چھن نہ جائے کہ عمر ہو رہی ہے اور طبیعت ناساز

ہے اور گا ہے ان کی علمی گوہر افشانیوں کی فسوں کاریوں سے متحیر مسکراتے بھی نظر آتے تھے۔ ان میں طالبِ علم بھی تھے، پروفیسر بھی، وائس چانسلر بھی اور ادیب شاعر اور نقاد بھی۔ اہم ناول نگار اور ڈرامہ نویس بھی، فلم اور سٹیج سے وابستہ لوگ بھی جن میں اردو گجراتی، انگریزی اور ہندی کے علاوہ دوسری زبانوں کے مدّاحین بھی شامل تھے۔ اور سب ہی کو علم ہے کہ اگر کسی نے جہانِ اردو میں دیانت داری سے فن کی پرکھ کی تو وہ ہم سب کے استادِ محترم پروفیسر وارث علوی ہیں۔ خالصتاً فن ہی کی بنیاد پر کسی کو سراہا تو وہی ہیں۔ قریبی اور دور کی سرحدوں کے پار کے فنکاروں پر اپنا جوہر شناس قلم اٹھایا تو بھی وہی ہیں اور گروہی بندشوں سے آزاد نئے جینوئن ادیبوں پر، ہمعصر نقادوں کی پرانی تھیوریوں کی پرواہ کیے بغیر لکھا ہو تو وہ بھی وارث علوی ہی ہیں، جن کی ذہانت کے برابر ادب کا کوئی پارکھ تا حال اردو کے منظر نامے پر نہ ابھرا ہو وہ بھی وہی ہیں اور جن کی بذلہ سنجی کا کبھی کوئی ثانی نہ ہوا ہو وہ بھی پروفیسر وارث علوی ہیں۔

یہ وہ باتیں ہیں جو میں نے انہیں پڑھ کر اور ان سے چند ایک بار فون پر بات کر کے محسوس کیں اور گھنٹوں متحیّر رہی۔ ایسی خوبیاں اصل میں کسی قاری کی سمجھ میں بہ آسانی آ بھی نہیں سکتیں کہ اکثر تعریف میں ترجیح کا پہلو بھی ہوا کرتا ہے مگر یہ بات ہندو پاک اور ان ممالک کے تمام لوگ، جہاں اردو ہے، جانتے ہیں کہ یہ ساری باتیں سچ کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ اب اس ساری سلسلے سے جڑی ایک بات یہ بھی ہے کہ ان کی صحت بہت دن سے بہت خراب ہے اور حیرت کی بات یہ کہ اپنی بیماری کے ہر پہلو پر وہ نہ صرف دل کھول کر قہقہے لگاتے ہیں بلکہ اس کے منفی اثرات کو اینجوائے بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ تو کیا آپ کبھی کسی ایسے انسان سے ملے ہیں؟ ہم تو آج تک نہیں ملے اور آئندہ بھی ملنے کی کوئی توقع نہیں

کہ ایسی بے نظیر شخصیات دنیا میں آسانی سے نظر ہی کہاں آتی ہیں۔ وہ دنیا کی ایسی تمام زبانوں کے پارکھ، جن میں ادب تخلیق ہوا ہو یا تنقید لکھی گئی ہو۔ جن کے لکھے ہر اقتباس میں سارے سچ، آدھے محاورے، نئی ترکیبیں اور ہر دوسرا جملہ ایسا ہو کہ آپ گاہے مسکرا دیں اور گاہے قہقہہ لگانے پر آپ کا اختیار نہ رہے۔ ہر دفعہ چند سطروں کے بعد آپ کو ایسا محسوس ہو کہ آپ تنقید نہیں کوئی فن پارہ پڑھ رہے ہیں اور بار بار ذہن کو یاد دلانا پڑے کہ آپ تخلیق نہیں تنقید پڑھ رہے ہیں تو کیا آپ حیرت اور اچنبھے کے سمندر میں بار بار غوطہ زن ہو کر ڈوبنے ابھرنے کے عمل سے دوچار نہ ہوئیے گا اور آپ کے ذوقِ مطالعہ کے ساتھ ایک حسین ستم یہ بھی تو ہو جائے گا کہ آپ اپنے کتب بینی کے معیار کے ساتھ تا عمر کوئی سمجھوتہ نہ کر پایئے گا کہ آپ کا متجسس ذہن ہر تحریر میں یہی فنی بلندیاں تلاش کرتا رہے گا اور انہیں نہ پا کر بے قرار رہے گا۔ ہم اس حسین ستم سے دوچار ہیں۔

شُرکاء کا قیام گجرات ودیا پیٹھ کے مہمان خانے میں تھا۔ اس دانش گاہ کی بنیاد سن انیس سو بیس (۱۹۲۰) میں گاندھی جی نے رکھی تھی۔ عمارتیں کچھ اتنے اونچے درختوں میں گھری تھیں کہ شاخیں چھتوں ہی نہیں، کھڑکیوں پر بھی آنچلوں کی طرح سایہ کیے دیتی تھیں۔ مہمان خانے کی داخلی دروازے کے قریب زمین پر جاذبِ نظر رنگوں میں دو مور نقش کیے گئے تھے۔ جس وقت میری آنکھیں ادھر اٹھی تھیں اسی وقت کانوں نے کہیں قریب ہی سے مور کے بولنے کی صدا سنی تھی۔ جو سیدھا راستہ آڈیٹوریم کی جانب جاتا تھا اس پر پیروں کے سفید رنگ نشان تھے۔ گویا کوئی راہبری کرتا ہوا آگے آگے جا رہا ہو۔ ہر نشان کے کنارے سرخ تھے۔ یہ سرخی ہمیں ماضی بعید اور ماضی قریب کے کتنے ہی حادثوں کا استعارہ معلوم ہوئی۔ جی چاہا کی سوٹ کیس وہیں راہداری کے قریب چھوڑ کر پہلے یہ دیکھ

آئیں کے قدم کہاں تک جاتے ہیں مگر دو دن کے قیام میں ہمیں وقت ہی نہ ملا۔ اب بھی دل میں خلش سی ہے۔ اطراف کی ہر شے میں ایک دل آویز سی سادگی تھی۔ ہاتھ سے بنے تولیے، نیم کے پتوں سے بنا صابن اور کھادی میں ملبوس طلبا پر، دل محبت سے لبریز ہوا جاتا۔ ہلکے سلیٹی رنگ قمیصوں اور سفید پائجاموں والی باوقار جوان پیڑھی کو دیکھ کر گلوبلائزیشن کے تہذیبیں چھیننے والے عالم بھر میں دَر آئے کنفیوژن پر دل میں غم کی لہر سی اٹھتی ڈوبتی مخصوص ہوئی۔ کینٹین سے لگے باغیچے میں ایک مور چہل قدمی کر رہا تھا۔ دل میں ایک بے تکا خیال ابھرا کہ یہ وہی مور ہوگا جس نے ہمارے آتے وقت صدا دی تھی۔

سن چھیانوے کے موسمِ گرما میں شملہ کے راشٹری پتی بھون میں منٹو پر ایک سیمینار میں پروفیسر وارث علوی کی تقریر سنی تھی، یعنی فن کے پیالے سے آگہی کی درافشانی ہوتی ہوئی دیکھی کہ علم کا ایک بحرِ بیکراں خورشید ہا کی ضیا سے منعکس ہو کر جہانِ دانش پر نور بکھیر رہا تھا۔

میں نے اس سے کچھ تین چار برس قبل ذرا سنجیدگی سے لکھنا پڑھنا شروع کیا تھا کہ بچے باقاعدہ سکول جانے لگے تھے اور کئی گھنٹے کا دن میرے اختیار میں ہوا کرتا۔ یہ ایک ہمہ زبان سیمینار تھا جس میں اردو کے بھی بعض اہم دانشوران حضرات نے شرکت کی تھی۔ پہلی بار اردو کی ادبی تقریریں سنی تھیں کہ زیادہ تر امتحانات میں نے سائنس کی طالبہ کی حیثیت سے پاس کیے تھے بلکہ شرکت کی دعوت پا کر، حسبِ عادت خاصی تحقیق کے بعد، منٹو پر ایک مقالہ لکھا تھا جو بے حد سراہا گیا تھا۔

پروفیسر علوی کی تقریر، لہجہ، تلفظ اور دنیا بھر کے لٹریچر پر قدرت، ان کے تنقیدی ذہن کی تخلیقی مہارت اور تجزیاتی خداوندی کا ملکوتی سا تسلسل دیکھ کر میں

اپنی نشست پر منجمد سی ہوگئی۔ سامعین ہمہ تن گوش تھے۔ پروفیسر علوی کی زبان جہاں ایک طرف کشمیری رباب کا صوفیانہ سنگیت منکشف کر رہی تھی وہیں میرے لئے بعض الفاظ ایسے مشکل تھے گویا طبلہ نواز نے 'زیر' پر ہاتھ ساکت کر کے 'بم' پر کچھ زیادہ زور کی تھاپ لگا دی ہو۔ اور ابھی علم کے درویشانہ تکیے پر نیم مجذوبانہ، فنا فی القلم نو وارد کی طرح میں اقتباسات کے حسن اور حسن میں پنہاں علم کو ذہن میں اتارنے کی کوشش کر رہی ہوتی کہ آنے والے کسی اور انجانے لفظ یا نئی ترکیب کے سحر سے محظوظ گاہے حیران تو گاہے پریشان ہو جاتی۔

والدِ محترم نے، خدا غریقِ رحمت فرمائے، مطالعے کی بابت سمجھایا تھا کہ کتاب پڑھتے وقت چیزوں کو یاد رکھنے کی کوشش کرنا ضروری نہیں ہے، جو باتیں پُر اثر ہوں گی خود ہی یاد رہ جائیں گی۔ چنانچہ جو باتیں پروفیسر صاحب کو سنتے ہوئے یاد رہیں ان میں آگہی ہی آگہی تھی اور اس کے ساتھ تشفی بھی بلکہ علم کے اس سمندر سے مزید موتی چننے کی آرزو اور تشنگی بھی کہ ذہن نے انہیں بطورِ استاذی بلند ترین مقام پر فائز کر دیا۔

پھر ان کی کتابیں پڑھتے بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایکسپریشنز کے معاملے میں استادِ محترم کی بیباک صاف گوئی نے ذرا حیران بھی کر دیا کہ آخر کو عورت ذات کا خاتونِ خوش کلام ہونا ضروری ٹھہرا مگر پھر پروفیسر صاحب کے اسلوب کا یہ تند و ترش حصہ تحریر سے کچھ ایسا میل کھاتا ہے کہ نہایت فطری معلوم ہوتا ہے اور کہیں پر بھی ناشائستگی کے زُمرے میں نہیں آ سکتا اور پھر یہ چیزیں اگر 'تجربات و حوادث' کی شکل میں ملی ہوں تو کیا انہیں لوٹایا نہیں جانا چاہیے۔

فنونِ لطیفہ میں تحریر کو ایک عظیم مقام دیا گیا ہے اور اسلوب میں جداگانہ رنگ پیدا کرنا ایک الگ فن ہے جو معنی کو تہہ دار نہ کیا کرتا تو پروفیسر علوی کی تحریریں دورِ

حاضر کے جہانِ اردو میں رائج، پھیکے شوربے جیسی یکسانیت کی موجودگی میں ایسے مثالے دار کشمیری روغن جوش کا کام نہ کرتیں جس میں زعفران کی مقدار اچھی خاصی ہو۔

بہر حال اس سیمینار کے کوئی دس برس بعد کی بات ہے کہ ساہتیہ اکادمی نے 'اردو کی نئی بستیاں' موضوع پر سیمینار منعقد کیا۔ عاشقینِ اردو دنیا بھر سے اور شائقینِ اردو شہرِ دلی کے گوشوں سے نکل کر آ جمع ہوئے۔ ہاں مرے میاں ڈاکٹر ریاض پنجابی بھی، کہ بڑے ڈائی ہارڈ قسم کے عاشقِ اردو ہیں اور ایک زمانے میں اردو میں اچھی اچھی کہانیاں لکھا کرتے تھے جو کتاب (لکھنؤ) علی گڑھ میگزین، آوازیں (علی گڑھ) گفتگو (ممبئی) اور شب خون (الہ باد) وغیرہ میں چھپا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر پنجابی نے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے پرائیویٹ ڈائننگ حال میں ایک شام دعوت کا اہتمام کروایا۔ ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے کہ پروفیسر علوی مداحین میں گھرے، نازک سا گلاس ہاتھ میں لیے اپنی منفرد بذلہ سنجی سے اپنے اُسلوب ہی کی طرح حاضرین کو بیک وقت حیران اور محظوظ کیے دے رہے تھے کہ باتوں کے دوران ان کی نظر داہنی جانب اٹھی جہاں لندن سے تشریف فرما رضا علی عابدی ہندوپاک، امریکہ اور کینیڈا وغیرہ سے، خود، یا اپنے میاں لوگوں کے ساتھ آئی خواتین میں گھرے اپنی آواز اور انداز کا جادو بکھیر رہے تھے۔ پروفیسر صاحب ایک قدم آگے بڑھے اور مسکراتے ہوئے کچھ یوں گویا ہوئے،

"رضا علی عابدی، تم خواہ کتنی ہی حسین عورتوں کے درمیان کھڑے ہو جاؤ، نظریں تمہاری ہی جانب اٹھتی ہیں۔" اس جملے سے محفل لالہ زار ہو گئی اور عابدی صاحب اپنی مخصوص بی بی سی اردو سروس والی سحر انگیز آواز میں ہنس پڑے۔

پروفیسر علوی نے غالباً ہماری کوئی کہانی کسی رسالے میں پڑھی تھی کہ فرمایا ان کی خدمت میں اپنی کتابیں ارسال کروں۔ ہم نے اپنی پہلی کتاب کچھ ایسے لوگوں کو جن کے بارے میں خیال تھا کہ ناقدین میں شمار ہوتے ہیں، بھیجی تھی۔ بعض ایک نے رسیدی فون تک نہیں کیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری کوئی کہانی بُری نہیں تو پھر کتاب کو ایکنالیج یا تسلیم نہ کرنا کیا تنقید کے اصولوں کی نفی نہیں کرتا۔ جب ہم خاصے بے وقوف ہوا کرتے تھے (ویسے اب بھی ہیں) اور کچھ باتوں کو ہم نے فار گرانٹڈ لے رکھا تھا۔ مثال کے طور پر یہ کہ ہر سینئر اپنے جونئیر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے خواہ غلطی پر سرزنش کر کے ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر کسی تحریر میں طاقت ہے تو اس بات کا ذکر نہ کرنا ادبی بد دیانتی ہے، وغیرہ قسم کے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ بڑی عجیب باتیں پتہ چلیں جیسے یہ کہ بعض مشہور لوگ بھی کسی نئے لکھنے والے کی اچھی تحریر سے اس درجہ ''عدم تحفظ'' کا شکار ہو جاتے ہیں کہ عناد سینچنے میں مصروف ہو جاتے ہیں، کمزور ادیب اور نان رائٹرس کی تو بات ہی نہیں کہ وہ کامیاب تحریر دیکھ کر بوکھلا اٹھتے ہیں اور کسی بھی معرکے کے فن پارے پر اپنی غیر درست زبان میں بڑی احمقانہ خود اعتمادی کے ساتھ بیمار قسم کی تحریریں شائع کرواتے ہیں۔

بہر حال ادبی سیاست سے اپنی لاعلمی کے باوجود ہمیں اپنی تحریر کی ایک ایک سطر پر جب بھی اعتماد تھا۔

سات آٹھ برس قبل جب پروفیسر علوی نے ہماری کتابوں پر ایک طویل مضمون ارسال کیا تو ظاہر ہے کہ اس لیاقت کے نقاد کا اپنی کہانیوں پر لکھا ۸۰ صفحات کا مضمون ہمارے لئے باعثِ سعادت تھا کہ پروفیسر صاحب محقق ہونے سے پہلے نقاد ہیں جبکہ ہمارے ہاں یہ ہی چلن رائج ہے کہ ہر محقق نقاد کہلانے کے

درپے ہوتا ہے بھلے ہی اس نے کسی موضوع پر پچاس بار ہو چکی تحقیق دہرائی ہو۔
اُس وقت تک ہمارے تین ہی افسانوی مجموعے شائع ہوئے تھے۔ اور کچھ تنقیدی
کتب، تراجم اور ایک ناول بھی چھپا تھا۔ آمد اور آورد کی تحریر کے بارے میں ہر فن
کار جانتا ہے اور اس کا تجربہ ظاہر ہے کہ قلم کار کو بھی ہوتا ہے۔ تخلیق کا پارکھ وہی
ہے جو تخلیق کی تحریری صورت کے کسی دوسرے ذہن میں وقوع پذیر ہونے والے
محرکات کی نشاندہی کرنے پر قدرت رکھتا ہو اور وہ بھی تخلیقی قدرت۔ پروفیسر
صاحب نے میری ہر کہانی کا تجزیہ کچھ ایسے کیا جیسے انہوں نے خود وہ کہانی لکھی ہو
یا انہیں میں نے بتایا ہو کہ میرے افسانے کے وجود میں آنے کا سبب فلاں فلاں
واقعہ بنا تھا کہ انہوں نے تحریر کے تاریخی، جغرافیائی، دنیاوی، ملکی و ذاتی محرکات
کی بھی تفصیل لکھی۔ ان کی کتابوں میں مختلف نگارشات کے مطالعے کے بعد
قاری ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ پروفیسر علوی فن پارے کے اندر اتنی گہرائی
تک اتر جاتے ہیں کہ اس کے محرکات اور اس سے جُڑے تخلیقی اسرار و رموز کا
سراغ پا لیتے ہیں۔

عرض یہ کرنا تھی کہ میری کہانیوں پر لکھے مضمون میں پروفیسر صاحب
نے ایک جملہ لکھا تھا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ترنّم ریاض کی ہر کہانی بہت اچھی ہے مگر
اچھی کہانیاں اتنی وافر مقدار میں ہیں کہ ثروت مندی کا احساس ہوتا ہے۔

ہم نے فون کیا کہ استادِ محترم ہماری کون سی کہانی اچھی نہیں ہے تو فرمایا
کہ مشکل تو یہی ہے کہ آپ کی کوئی کہانی بُری نہیں ہے مگر میں محض تعریف ہی نہیں
کروں گا تاکہ آپ مزید لکھ کر اردو ادب کو مالا مال کرتی رہیں۔ ہم نے ڈرتے
ڈرتے ایک اور سوال داغ دیا کہ کہانی 'یمبرزل' پر کچھ تفصیلی ذکر نہیں ہے تو فرمایا
کہ یہ افسانہ ایک الگ مضمون طلب کرتا ہے۔ جو غالباً وہ مستقبل میں لکھنے کا ارادہ

رکھتے ہیں۔ اس کے بعد میرا چوتھا مجموعہ 'میرا رختِ سفر' شائع ہوا تو محترم استاذی نے مجھے ایک ایک کہانی پر مبارک باد دی۔ اور ملک غیر ملک میں کچھ اچھے ریویوز آئے بھی مگر ایک زیادتی یہ ہوئی کہ ناول 'برف آشنا پرندے' جو میں چار پانچ برس سے لکھ رہی تھی، سن دو ہزار نو (۲۰۰۹ء) میں شائع ہوا اور ایک دم مشہور ہو گیا۔ کئی ایڈیشن نکلے۔ لوگوں کی توجہ ناول کی طرف مبذول ہو گئی اور افسانوی مجموعے کو تا دمِ حال اس کا حق نہیں ملا۔

میرا ایک یقین ہے کہ اچھا انسان ہی شفاف فن کی تخلیق کر سکتا ہے۔ میرا دوسرا یقین اس بات پر بھی ہے کہ فن کی دیانت دارانہ پرکھ کے لیے نقاد کے یہاں کہیں نہ کہیں تخلیقیت کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔

پروفیسر علوی کی زبان شیکسپیئر کی تنقیدی زبان کی طرح تخلیقیت سے اس قدر بھرپور ہوتی ہے کہ تخلیق کا دلدادہ مزاج مکمل تشفی حاصل کرتا ہے۔

پروفیسر علوی کے یہاں جو ایک منفرد اپروچ اور ایک جدا سی تجزیاتی قدرت نظر آتی ہے، وہ کوئی آسان معاملہ نہیں ہے۔ اس کے لئے فنونِ لطیفہ سے وابستہ، دنیا بھر کے علم کو پی لینے کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمن اور اطالوی زبان کے شعر ادب کو اپنی نسوں میں اتار کر روانیِ خون میں شامل کرنے کے علاوہ شعور اور تحت الشعور کی کئی سطحوں پر ہوش سنبھالنے کے بعد سے مسلسل بسائی ہوئی جتنہ جتنہ انفارمیشن، قریہ قریہ سیکھی ہوئی تاریخ اور جغرافیہ، لحہ لحہ اندرون ملک اور غیر ملک سے مشاہدے میں آئی ادبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورت حال، نئی چیزوں کو قبول کرنے کی جدت طبعی، ملکہ ایلزبیتھ اور شیکسپیئر کے زمانے کے رینا ساں اور فنون لطیفہ کی دیگر اصناف کا مشاہدہ، اور اُس نشاطِ ثانیہ کا اثر قبول کرنا کہ رینا ساں سے کوئی بھی ذی عقل متاثر نہ ہونا ایفورڈ نہیں کر سکتا۔ وہ

کالج کے دنوں میں بھی بنگال کے اہم ادیب ایم این رائے کی تحریروں میں ایسے کھو جاتے تھے کہ کچھ پا کر ہی ہوش میں آتے تھے۔ اس کے ساتھ انہوں نے مراٹھا حکومت کے زوال کے بعد گجراتی ادب کا وہ انقلاب بھی دیکھا جب ممبئ میں کالج کے قیام میں آنے پر کہا گیا تھا کہ اب سورج نکلا ہے۔ گویا بنگال کا رینا ساں، گجرات کا رینا ساں۔ اردو کا رینا ساں یا عناصرِ خمسہ کا دور۔ ان کے ذہن کی تربیت میں جن طاقتوں نے کام کیا وہ طاقتیں آج بھی زندہ ہیں اور پروفیسر علوی کا ذہن آج بھی دہائیوں پہلے کی مانند تروتازہ ہے۔

یہ دوروزہ سیمینار ان کی شخصیت اور فن پر گجرات اردو ساہتیہ اکادمی نے منعقد کیا تھا اور اس میں گجراتی زبان میں لکھے ان کے ڈراموں کا مجموعہ جس میں تین تین ایکٹ کے ڈرامے بھی ہیں، ریلیز ہونا تھا۔ ان دو دنوں میں ہم نے دیکھا کہ وہ دوسری زبانوں میں بھی کس قدر مقبول اور محترم ہیں اور علم و ادب کا ہر طلب گار بارگاہِ ادب میں باادب بیٹھا ان پر نثار ہونے کو بے قرار ہے۔

گویا، میرے مرشد ہیں سامنے میرے
سر اٹھاؤں کہ سر جھکاؤں میں

(ت ر)

اور وہ بھی عصا ٹیکتے بمشکل قدم اٹھاتے آتے، بیٹھتے اور علم کی گوہر افشانی میں گم ہو جاتے اور مدّاحین گویا کسی غیبی طاقت کے زیرِ اثر دنیا و مافیہا سے بے خبر علم کے سمندر میں غرق ہوئے جاتے۔

علم وفہم کی ایسی درافشانی کے علاوہ ان کے زندگی کی طرف درویشانہ انداز کا بھی ہاتھ ہے کہ ادب کے تئیں یہ دیوانگی کسی ایجنڈے کے تحت نہیں، بلکہ ایک صوفیانہ تشنگی، ایک قلندرانہ سرشاری، ایک فنا فی المُرشد قسم کی ریاضت کے

جنون کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا ساتھ استادِ محترم کے لئے ایک ایسا میڈیٹیشن یا اِستغراق ہے گویا مرید اپنے پیر کی صحبت میں مراقبے میں ہو۔

مردِ دانا ہے اسے کب حرص کر پائی اسیر
بادشاہ اَوروں کی خاطر، واسطے اپنے فقیر

(ت ر)

اس کالم کو سردار جعفری کی ایک اہم نظم 'کربلا' کے ایک بند پر ختم کرتے ہیں، کہ معالات جب بھی ایسے ہی تھے،

یہ مدرسے دانش کدے، علم و ہنر کے مے کدے
ان میں کہاں سے آ گئے، یہ کرگسوں کے گھونسلے
یہ جہل کی پرچھائیاں، لیتی ہوئی انگڑائیاں
دانش ورانِ بے یقیں، غیروں کے دفتر کے امیں
ان کے تصرُّف میں نہیں، خونِ بہارِ زندگی
ان کے تصرُّف میں نہیں، خونِ حیاتِ جاوداں
برہم ہے ان سے رنگِ گل، آزردہ ہے بادِ صبا
اے کربلا، اے کربلا!"

خدائے بزرگ و برتر ہر زبان کے بڑھتے ہوئے شجر کو کرگسوں کے گھونسلوں سے محفوظ رکھے۔

☆☆

بساط بھر آسماں

کراچی گورنر ہاؤس کے سرسبز باغیچوں میں بھی میری نظریں حسبِ معمول اسی شے کی متلاشی تھیں جسے پچھلے تین دن سے دیکھنا چاہ رہی تھیں کہ پچھلے کئی مہینوں میں اسے اپنی سرزمین میں بھی تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ اس وقت بھی شام کی روشنی نے دل میں بڑی اُمیدیں بھر دی تھیں۔ یہاں سے روانگی دن کی تھی اور سفر ڈیڑھ پونے دو گھنٹے کا۔

اُس وقت دن تھا اور سفر کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کا مگر میری ایک ایسی ہی اور مطلوبہ شئے مجھے استقبالیہ احاطے میں نظر آ گئی تھی۔ ایک نئی نئی اماں کی گود میں سال بھر کا ایک بے قرار سا بچہ جو ماں کے نشست پر بیٹھتے ہی آسمان سر پر اٹھانے لگتا تھا۔ اپنی ننھی سی آواز میں، اپنا بساط بھر آسماں۔ ایسے ہی ایک وقفے میں جب وہ اپنی گردن بے بسی سے دائیں بائیں موڑ رہا تھا اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں بھی اسی دھن میں تھی کہ اس سے میری دوستی ہو کہ پرندوں اور بچوں کو نہارنا میرے لیے وقت کے بہترین استعمال والے معاملوں میں شامل ہوتا ہے اور اس سلسلے میں مَیں خوش نصیب بھی واقع ہوئی ہوں کہ یہ ننھے منے میری جانب کھنچے چلے آتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پل بھر کو چپ ہو گیا اور اگلے پل ماں کی گود سے اُتر کر

چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا کچھ متجسّس ، کچھ حیران اور کچھ دوستانہ نظروں سے میرے چہرے کو بغور دیکھتا میری طرف آنے لگا کہ میں سامنے والی صف میں تھی اور اس کی ماں کو بھی یقین تھا کہ وہ دور نہیں جا رہا تھا مگر میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور وہ کچھ قدم کی دوری سے رک کر لمحہ بھر دیکھ کر واپس پلٹ گیا۔ میں برابر کی کرسی پر بیٹھی ساتھ سفر کرنے والی خاتون کی طرف منہ موڑ کر بات کرنے لگی۔ اور وہ اگلے ہی لمحے کسی وقت آ کر میرے گھٹنوں سے لگ گیا۔ دل میں خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ میں نے ہاتھوں میں اُٹھانا چاہا تو وہ پھر پلٹ گیا۔ ہم لوگ اپنے اور ساتھیوں کے بارے میں دریافت کرنے لگے کہ کون ائیر پورٹ پہنچا اور کون نہیں۔ ایک اور صاحب آئے کاغذوں واغذوں میں اندراج کیا گیا مگر اس دوران بھی میری نظریں اس بچے کی جانب اُٹھ جاتیں جو کبھی ننھے جوتوں سے آواز پیدا کرتا دو قدم چلتا یا پھر ماں کے گھٹنوں پر بیٹھا اس کے چہرے پر ہاتھ دھرے کسی انجانی زبان میں اُسے اٹھ کر ٹہلنے کی فرمائش کرتا۔ وہ تھکی تھکائی غریب نہ اُٹھتی تو چھوٹا سا دہانہ بڑا سا وا کر کے زور سے رو دیتا۔ میں نے بلکہ یہ بھی دیکھا کہ وہ ماں کے رخساروں پر پیار بھی کرتا اس کے کانوں کے بُندے الٹتا پلٹتا ننھی منی اپنی انگلیوں میں اس کے بال الجھا الجھا کر مروڑ دیتا۔ مجھے جہاں یہ سب نہارنا دلچسپ لگتا وہاں اپنے بچوں کا بچپن بھی یاد آتا کہ پرورش میں والدین اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ بعض اوقات بچوں سے کھیلنے تک کا وقت نہیں ملتا اور جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو انہیں والدین کے ساتھ وقت گذارنے کے لئے اتنا وقت میسر نہیں ہوتا۔

بورڈنگ کا اعلاان ہوا تو ماں بیٹے؟ بچہ پھر رونے لگا تو میں نے اپنے دائیں گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ اسے گود سے اتارنے پر تیار نہیں تھی اور وہ اس کے

بڑے بڑے بازوؤں میں چھوٹے سے پرندے کی مانند چھٹپٹاتا شور مچا رہا تھا۔
فضا میں قدرے حبس تھا۔ اور اب تک وہ جو بغیر آنسوؤں سے رو رہا تھا اب
باقاعدہ آنسو بہانے لگا تھا۔ اس منظر سے میرا دل بے چین ہو گیا۔

جہاز نے اڑان بھری۔ سانس لینے میں کچھ تازگی محسوس ہوئی۔ مگر ننھے
میاں تھے کہ مسلسل رو رہے تھے دو ایک لوگ پلٹ کر دیکھتے ناگوار سی شکل بھی بنا
رہے تھے چونکہ غافل تھے معصومیت کی سچائی سے اور کچھ لوگ میری طرح بے قرار
بھی ہو رہے ہوں گے کہ جانتے ہوں گے مسرت کے اصل لمحات ایسے ہی ہوا
کرتے ہیں جب کسی بچے کو کوئی پر سکون کر دینے پر قدرت رکھتا ہو۔ زمین پر اس
کی ماں نے جب مجھے ذرا دلچسپی لیتے دیکھا تھا تو کچھ لاتعلق سی معلوم ہوئی تھی۔
جانے کیا سوچتی ہوگی۔ شاید وہی جو اکثر بے کار گھریلو زندگی میں دلچسپی کا سامان
پیدا کرنے کے لئے توہمات پیدا کیے جاتے ہیں کہ نظر لگتی ہے۔ اسی لاتعلقی کے
سبب میں نے براہِ راست ادھر نظر نہیں ڈالی مگر چپکے سے دیکھنے پر پھول سے
چہرے پر آنسوؤں کی لڑیاں نظر آئیں۔ کچھ دیر بعد جب بچہ خاموش ہی نہیں ہوا تو
میں نے بے چین ہو کر اُدھر دیکھا۔ اس کی ماں بڑی بے بسی سے میری ہی طرف
دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے میرے پاس بھیجنے کو کہا تو اس
نے فوراً اُسے گود سے اُتار کر میرے برابر والے مسافروں کے ذریعہ اسے میرے
پاس بھیجا۔ اس نے ننھی سی قمیص پہن رکھی تھی باقاعدہ کالر اور بٹن والی اور کچھ
موٹے کپڑے کی تھی۔ اندر بھی ایک قدرے موٹے کپڑے کی ٹی شرٹ تھی۔
جوتوں کے اوپر وہ موٹے کپڑے کی جینز پہنے تھا۔ میرے پاس آتے ہی وہ
یکا یک خاموش ہو گیا اور ایک لمبی سانس لیے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسے کھڑکی
سے باہر کا کھلا آسمان نظر آیا۔ پھر میرے ہاتھ میں بندھی گھڑی کھولنے کی کوشش

کرنے لگا اور اس میں ہی مصروف ہو گیا۔ ناشتے کے وقت میں نے اس کے لیے جُوس لیا اور اشارے سے اس کی ماں سے پوچھا کہ اوپر کی چیزیں کھا لیتا ہے تو بولی ہاں۔ چھوٹے سے پلاسٹک کے چمچ سے اسے ذرا سا پلانے لگی۔ چائے کی شدید طلب کے باوجود کہ کہیں میری ذرا سی جُنبش سے اس کا اردہ بدل نہ جائے، نہیں پی کہ اسے شربت پلانے کا سُکھ کسی روحانی سکھ سے کم نہ تھا۔ اس کی ماں نے بھی دو ایک بار مجھے اپنی نشست سے اشارے سے پوچھا تھا کہ میں خود کچھ کھاؤں گی نہیں میں نے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔ میرے برابر میں ایک تیمار دار اور اس کے برابر میں مریض بیٹھا تھا جو انڈیا سے جگر کے آپریشن کے بعد واپس وطن جا رہے تھے۔ درمیان میں بیٹھے شخص نے اپنی نشست بچے کی ماں سے بدلنے کی پیشکش کی تو وہ میرے برابر میں آ بیٹھی۔ بچہ ماں کو قریب دیکھ کر خوش ہوا مگر میرے پاس ہی بیٹھا رہا۔ اب اس کے چہرے پر سکون تھا۔ میرے گھٹنوں پر کھڑا ہو گیا اور میرے چہرے کو دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا۔ پھر انگلی سے میری ناک کی لونگ کو دبانے لگا۔ پھر کانوں میں کسی زیور کو نہ دیکھ کر اس نے میرے بالوں کو کھینچنا چاہا۔ وہ جوڑے میں بندھے اس کے ہاتھ نہ آئے۔ کچھ مایوس ہو کر اس نے میرے شانے پر کالی سفید ساری کے سفید پھول کو کھینچا تو کندھے پر لگے بکسوئے سے آنچل ذرا سا پھٹ گیا۔ ماں نے اسے نام لے لے کر زور سے پکارا مگر اس ننھے سے انسان کو اپنے اس کارنامے پر اتنی خوشی ہوئی کہ وہ کھینچنے کی کوشش کرتا ہنستا رہا۔ اور ہنسی اتنی میٹھی کہ انسان فدا ہونے پر تیار ہو جائے کہ نیچے چار دانت اور اوپر کے دو جو ننھے موتیوں کی طرح نظر آتے تھے اور اس کی آنکھوں میں شرارت بھری چمک تھی کہ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی کہ وہ ماں کے چہرے پر اپنی حرکت کا کچھ ناپسندیدہ سا ردعمل دیکھ کر باغ باغ ہو رہا تھا۔ گویا یہ بات انسان

کی سرِشت میں ہے کہ وہ خود کو منوانا چاہتا ہے۔ بھلے ہی سال بھر کا منا سا آدمی ہو۔ یہ بات غالباً اور جانداروں میں بھی ہوتی ہوگی، میں نے خود کو سوچتے ہوئے پایا۔ حیوانات لڑتے تو ہیں مگر کس جذبے کے تحت یہ الگ معاملہ ہے۔ عام طور پر اپنے علاقے کے لئے یا ساتھی کے لیے، اس میں انا کا معاملہ کتنا ہے یہ نہیں جانتے۔ پرندوں کو لڑتے دیکھتے ہیں ہم۔ میدانی علاقوں میں بھی بڑے خوبصورت اور شرمیلے پرندے ہوا کرتے ہیں وہ بھی لڑتے ہیں۔ شکاری پرندہ تو جھپٹ کر چھوٹے پرندوں کو دبوچ لیتا ہے مگر چھوٹے پرندے بھی بہت طرّار ہو سکتے ہیں۔ سیاہ موتی جیسی آنکھوں والی، چیخ چیخ کر کُو کنے والی فاختہ کو ایک دفعہ ایک کوئے کا بار بار پیچھا کرتے دیکھا تھا، اس ظالم نے شاید اس کے گھونسلے پر حملہ کیا تھا مگر سامنے درختوں میں جب وہ آتا جاتا نظر آتا وہ اس کے پیچھے ہو لیتی۔ کوا کائیں کائیں کرتا ادھر اُدھر اُڑتا پھرتا کہ فاختہ کی چونچ میں بھی زور تو ہوتا ہی ہے۔ اس نے ایک آدھ ضرب ضرور کھائی ہوگی جس کا اسے خوف تھا۔ ایک اور پرندہ اکثر سات کے جھنڈ میں ہوتا ہے، سات کے سات خوب شور مچا کر لڑتے ہیں۔ انگریزی میں اسے seven sisters کہتے ہیں خدا جانے یہاں اس کا نام کیا ہے۔ مٹیالے رنگ کا سفید سی آنکھوں والا۔ آواز سریلی نہیں ہوتی اس کی مگر بہر حال درختوں کی فضا کو توازن بخشتا ہے۔ بلبل سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ اور بھی ننھے خوش گلو پرندے ہوتے ہیں کبوتر اور چڑیاں مگر ادھر ایک شئے دل کو بڑا اداس کیے دیتی ہے کہ جو عام چڑیاں ہم بچپن سے دیکھتے آرہے ہیں وہ نظر ہی نہیں آرہیں۔ کہتے ہیں ان کی تعداد بہت گھٹ گئی ہے اور اب اُنہیں بچانے کا کام کیا جارہا ہے۔ سوچیے ذرا وہ ننھی سی چڑیا ہلکے اور گہرے بھورے رنگ کی جس کی چہچہاٹ کانوں کی مستقل جگہ تھی۔ اور جسے ہم نے بچپن میں دانہ چگتے، اُڑتے،

لڑتے دیکھا ہے۔ جس کے ننھے بچوں کو چڑیا کو چلنے اور اُڑنے کی مشق کراتے دیکھا ہے وہ نظر نہ آئے تو؟ یہ گھریلو چڑیا کہلانے والا پرندہ آخر کار ختم ہو رہا ہے کہ ہم نے ماحول کو اتنا بکثرت استعمال کیا کہ ان کے ٹھکانے خطرے میں پڑنے لگے۔ ان کے انڈوں کو شاید مخصوص قسم کا درجہ حرارت درکار ہو گا یا ان کے ننّھے مُنّے پھیپھڑوں کو وہ تازہ ہوا نہ ملی ہو گی ۔ میں آجکل جہاں جاتی ہوں نظریں اسے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ بات چڑیا کی ہو رہی تھی ادھر مجھے اسے تلاش کرنے کا کچھ جنون سا سوار ہو گیا تھا کہ جدھر جاتی نظروں کو اسی کی کھوج میں پاتی کیونکہ عام شے اگر کم یاب ہو جائے تو اس کے عُنقا ہو جانے کا خوف اسے اہم بنا دیتا ہے۔ کئی مہینوں سے میں اسے اپنے وہاں میدانی علاقوں میں بھی ڈھونڈتی پھری اور مایوس ہوئی۔ اس کے غم میں میری اکثر شامیں اداس رہیں کہ میں نے اس کے بغیر جینا نہیں سیکھا تھا۔ اس وقت نئی جگہ پر اسے دیکھنے کی آس رنگ لائی اور جناح میوزیم کے باغ میں نے اپنی پیاری گوریا کے جھنڈ کو پھدکتے دیکھا۔

میری اکثر شامیں اداس رہیں کہ میں نے اس کے بغیر جینا نہیں سیکھا تھا۔
تین روز قبل جب روانہ ہوئی تھی تو دل میں اس عزیز شئے کے دیدار کی آس بھی تھی۔

کراچی کے آرٹ کونسل میں شام کو مشاعرے کے انعقاد سے پہلے تقریب کے لئے شہر بھر کے فن کے دلدادہ جمع تھے۔ سامنے کچھ لڑکے عمدہ سا رقص پیش کر رہے تھے۔ اُسی وقت امن کے استعارے کے طور پر بڑے بڑے پنجروں میں بند کبوتر بھی آزاد کیے گئے جو تیز اور مصنوعی روشنیوں سے سراسیمہ ہو ادھر اُدھر اڑتے رہے۔

کسی کو عمارت کی چھت پر پاؤں ٹکانے کی جگہ مل گئی اور کوئی بجلی کے تار پر توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں گھنٹوں پھسلتا رہا۔ حضرت انسان نے دنیا کو

صرف اپنا سمجھ رکھا ہے اور کرۂ ارض کا استحصال کئے چلا جا رہا ہے۔ اسے نہ آنے والی نسلوں کی فکر ہے اور نہ ہی دوسرے جانداروں اور نباتات کی پرواہ۔ فطرت کا توازن متاثر ہوگا تو دنیا زیادہ تیزی سے فنا ہو جائے گی۔

چاند کی خاطر

جنوبی ہند سے شائع ہونے والا انگریزی روزنامہ 'دی ہندو' نسبتاً ایک متوازن اخبار کہلاتا ہے کہ انصاف پسند موقف بھی ظاہر کیا کرتا ہے۔ پچھلے ماہ یعنی ۱۹ فروری کے اخبار کی پہلی سرخی میں دو تصویریں شائع ہوئی تھیں۔ صاحبِ تصویر کا نام بالا چندرن تھا اور عمر گیارہ بارہ برس۔ بالا چندرن یعنی بالک چندر، یعنی معصوم سا ننھا چاند یا چاند سا بچہ یا بچے ایسا چاند۔ پہلی تصویر میں وہ ہرے رنگ کی تھیلیوں کے سامنے بنکر میں بیٹھا ہے۔ خاکی اور سیاہ رنگ کی نیکر پہنے ہوئے۔ اس کی گود میں سرخ رنگ کی کوئی ٹماٹر یا گاجر ایسی کھانے کی چیز رکھی ہے۔ اس کے قریب ہی سرخ پلاسٹک کے جگ میں پانی ہے۔ گول گول ہاتھوں سے وہ یہ چیز کھا بھی رہا ہے۔ بھولی سی حیران آنکھیں دو تصویروں میں اپنے اطراف دو جانب دیکھ رہی ہیں۔ پھول ایسے چہرے پر کچھ میلے سے دھبے ہیں جو غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ سوکھے ہوئے آنسو ہیں۔

اندرونی صفحات پر کچھ اور تصاویر بھی ہیں اور ایک تصویر میں ننھا چاند سینے پر تین فٹ سے کم دوری سے پانچ (۵) گولیاں کھا کر زمین پر گرا ہے۔ اطراف میں کچھ اور لاشیں ہیں، غالباً اس کے محافظوں کی۔ یعنی باڈی گارڈس کو

بھی اس نے مرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ نام نہاد بڑے دماغ جنگیں چھیڑ کر کتنے چھوٹے پن کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور ننھی ننھی جانیں جنہیں اس سارے نفع نقصان کی کوئی سمجھ نہیں ہوتی، دکھ اٹھاتی ہیں، اپنوں کو گنواتی ہیں، یتیم ہو جاتی ہیں اور اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ انسانی فطرت جب تک خود کسی اصول کی کاربند نہ ہو، ہر بندش سے آزادی طلب کرتی ہے۔ کوئی بھی کسی سے بھی، جیسے پرندہ صیاد سے، عورت استحصال کرنے والے مرد سے، بے وفا مرد وفادار عورت سے، عوام بدعنوان قائد سے وغیرہ وغیرہ۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے حضرتِ انسان کیا کیا نہیں کر گزرتا۔ فوجیں باغیوں کو پسپا کرنے کی خاطر کسی بھی حد تک چلی جاتی ہیں۔ بدعنوان حکمران اپنے عیبوں کو چھپانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑتے۔ حسد میں لوگ دوسروں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے خود بھی فنا ہو جانا غلط نہیں گردانتے، وغیرہ۔ مگر کیا انسان کی طرف سے وضع کردہ کوئی قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ بچے، جو کچھ نہیں جانتے یا سمجھتے، ان کی بھی جان لے لی جائے۔ ان ننھے مُنّوں کو کون سی آزادی چاہیے سوائے ان کی سب سے بڑی آزادی کے کہ سکول کے کام سے نجات پا کر ماں کی گود کی پناہ لی جائے یا دن بھر باپ سے الگ رہنے کی قید کے بعد اس کی مضبوط بانہوں کے سہارے ذرا سی دنیا دیکھ لی جائے۔ اپنے کھلونوں کی حفاظت سے زیادہ انہیں کس حفاظت کی سمجھ ہوگی اور پریوں کی نگری کی سیر کرتے کرتے بڑے ہو کر کچھ بننے کے (وہ بھی بڑوں کی خاطر) کیا درکار ہوتا ہے۔ تو پھر کیا طاقت کو اتنی چھوٹ حاصل ہونی چاہیے کہ وہ بغیر عمر و سن کا لحاظ کئے ہتھیار استعمال کرتی چلی جائے۔ کسی ملک کا سیاسی موقف کیا ہے اور کسی عوام کا سیاسی نظریہ کیسا ہے، اس سے قطع نظر ہتھیار والا انسان اشرف المخلوق ہے تو اس کے پاس ایک اپنا

دماغ بھی ہے جسے وہ طاقت کے مظاہرے کے وقت استعمال کرسکتا ہے۔ کیسا لگا ہوگا اس بندوقچی کو جب اس نے ننھے سے بالا چندرن کی چند ایک انچ کی چھاتی میں آدھ درجن کے قریب گولیاں اتار دی ہوں گی۔ کتنی دور تک گئی ہوگی اس کی معصوم چیخ۔ اس کے کس اپنے نے اس کی مختصر سی زندگی کی آخری چیخ سنی ہوگی۔ کیا اس قاتل کے اپنے بچے ہوں گے۔ کیا وہ خود کسی کی اولاد نہیں ہوگا۔ کیا قصور تھا اس معصوم کا سوائے اس کے کہ اس کا باپ تمل لبریشن فرنٹ کا سربراہ تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اس کا باپ ویلوپلائی پربھاکرن خود کو قید سمجھتا ہے اور یہ بھی کہ غلط سمجھتا ہے یا صحیح۔ اسے کیا پتہ تھا کہ تمل ٹائگرس کا تمل ٹائگرس نام کیوں ہے اور تنظیم کسے کہتے ہیں۔ گاندھی جی نے کسی بھی استحصال کے خلاف اہنسا کے راستے پر اسی لئے زور دیا تھا کہ انسانی جانیں قیمتی ہوتی ہیں چاہے صورتِ حال کیسی بھی ہو۔ پربھاکرن کے گیارہ سالہ بیٹے کے علاوہ اس کا بڑا بیٹا چارلس اینتھنی اور بیٹی اور بیوی بھی مار دیے گئے تھے مگر بچپن کا لحاظ کرنا ہر ذی عقل انسان کا فرض ہے۔ دو تین برس قبل جب ہماری وادی میں نوعمر لڑکے جانے کس کے کہنے سے وردی والوں پر کنکر پھینکتے تھے تو وردی والے بہادر جوان ان پر گولیاں برساتے تھے۔ اور ان پر بھی جو کنکر نہیں پھینکتے تھے اور کہیں سے نکل کر کہیں جانے کی خاطر اچانک سامنے آجاتے تھے۔ جب ان کے چھوٹے چھوٹے مردہ جسم ماؤں کے سامنے لائے جاتے تھے تو مائیں آگے آنے والے برسوں کے لئے دیوانی یا دل کی مریضائیں ہو جاتیں اور باپ مفلوج ہو جاتے۔ کسی ظالم فوٹوگرافر نے ایک تصویر شائع کی تھی کشمیر کے اردو روزنامہ 'کشمیر عظمیٰ' میں اُن دنوں۔ اسے دیکھ کر ہماری کئی روز تک نیند اڑ گئی تھی۔ ایسے ہی جیسے بالا چندرن کا نازک سا بدن دیکھ کر روح کہیں اندر تک افسردہ ہوگئی ہے۔ وہ بھی کوئی نو دس برس

کا تھا۔ مردہ جسم کتابوں کے بوجھ سے ایک طرف کو خمیدہ زمین پر ڈھیر تھا، ڈھلکی گردن سے لگے چاند ایسے اجلے بے جان چہرے کے ادھ کھلے دہانے میں سے ادھ چُچی چیونگم جھانک رہی تھی ۔ جانے اس کا نام کیا ہوگا ۔ یا اس کے ہم عمر دوسرے لڑکوں کے کیا نام رہے ہوں گے ۔ ان کا حراستوں میں کس کس طرح استحصال ہوتا ہوگا۔ اتنا معصوم اور نادان سن اور اتنے بہت سے نام ۔ چاند جیسے، سورج جیسے، ستاروں جیسے، بڑے چھوٹے اور بہت سے ۔ حسین اور بامعنی نام ۔ جیسے ہلال احمد، آفتاب عالم، انجم، اختر، اکبر، اصغر، یا چندرن، یا سوریہ، اور ایسے ہی بہت سے دلارے اور عزیز نام ۔ پر بھاکرن کے گیارہ سالہ بیٹے کی زندگی جانے کس خطرے کے اندیشے کے پیشِ نظر لی گئی ہو ۔ ویسے فوج کو من مانی کرنے کی عموماً کھلی چھوٹ ہوا کرتی ہے ۔ کیا واقعی جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے؟ اگر ہاں تو پھر تہذیب کس بلا کا نام ہے ۔

کچھ یہ کہتے ہیں کہ سری لنکا کی سرکار بچے کے قتل کی ذمہ دار نہیں اور کوئی کہتا ہے کہ ہے ۔ سوال یہ ہے کہ ننھی سی جان تو گئی ۔ خونریزیوں کا اصل شکار معصومیت ہی تو ہوتی ہے ۔ اُجاڑے گئے مقامات پر کیمپ اور یتیم خانے کھل جاتے ہیں ۔ وہاں سب غیر ہوا کرتے ہیں جنہیں ننھی منی آنکھیں پہچانتی ہی نہیں ۔

موتی چھوڑ کے سیپی چُن لیتے ہیں بچے
چاند کی خاطر بھی یہ پھول مچل جاتے ہیں

(ت ر)

☆☆

دکن کے ہم زمانہ

کچھ ماہ قبل، حیدرآباد میں واقع مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں تانیثیت پر ایک سیمینار ہوا تھا۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں سے وہاں ملاقات ہوئی جو اپنے اپنے طور پر اردو کی خدمت میں مصروف، مشغول و مسرور تھے۔ موسم گو سردیوں کا تھا مگر وہاں درجۂ حرارت قدرے زیادہ تھا اور جانے کس سمت سے ٹھنڈی معطر سی ہوائیں آ کر صبح شام لہراتی تھیں۔ سرخی مائل زرد ریتیلی چٹانیں یہاں وہاں ایستادہ کیمپس کے حسن میں اضافہ کیے دیتی تھیں۔ پرندے ہری شاخوں میں چھپتے عیاں ہوتے، بولتے تھے اور گیسٹ ہاؤس میں برقی کیتلی، خشک دودھ اور چائے والے انتظام نے ہماری صُبحوں کا وقت بچالیا کہ چائے خود بنا کر پینا اور کچھ لکھنا پڑھنا ہمارے دن کا ایک اہم حصہ ہوا کرتا ہے، سو ہم نے وہ کتابیں پڑھیں جو ہمیں ادباء نے عنایت کیں۔ سب سے پہلے ہمیں دو کتب پروفیسر خالد سعید نے دیں۔ 'معنیٰ کا گمان' اور 'پسِ تحریر'۔ اردو تنقید کی کتب بڑے بڑے حجم کے ساتھ مجلد چھپا کرتی ہیں اور یہ دونوں کتابیں کاغذی جلد میں تھیں اور ضخامت بھی کچھ زیادہ نہیں تھیں۔ پڑھیں تو جہانِ معنیٰ سمیٹے۔ موضوعات کا تنوع اور زبان کے استعمال میں وہ مہارت کہ انسان پڑھتا ہی چلا جائے۔ تنقید

اگر خود کو پڑھوا لے تو یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ مجبوری میں تنقید پڑھنا فلسفہ پڑھنے کی طرح ہوسکتا ہے جس سے صرف فلسفی ہی لطف اندوز ہوتے ہیں اور عام انسان اسے خشک مطالعہ خیال کرتا ہے۔

'پسِ تحریر' میں مشتاق احمد یوسفی کے فن پر ایک مضمون میں ڈاکٹر سعید لکھتے ہیں،

''یوسفی کا فن دراصل تاویلات کا فن ہے۔ ان کی یہ تاویلات نکتہ سنجی، استنباطی فکر اور استدلالی انداز سے مرکب ہے۔ نکتہ سنجی اور استنباتی فکر وہ دولت ہے جن کی بدولت فلسفے میں نظریہ سازی اور سائنس میں اختراعات و ایجادات عمل میں آتی ہیں۔ نکتہ سنجی جب علت و معلول کے رشتے سے جڑ جاتی ہے تو منطق کہلاتی ہے اور استنباطی فکر جب دال و مدلول سے اپنا رشتہ قائم کر لیتی ہے تو علم الکلام کا جوہر ٹھہرتی ہے۔ اور یہی استنباطی فکر جب تخلیقی قوت سے جڑ جاتی ہے تو امکانات کا درجہ حاصل کرتے ہیں اختراعات اور ایجادات کا۔ یہ تینوں صورتیں فلسفہ، علمی معاملات اور ایجادات میں حسن اور ہنر ہیں لیکن ادبی معاملات میں انہیں اپنانا اور پھر ادب کو ادب رہنے دینا، کسی بھی فنکار کے لیے پُل صراط سے گزرنے کے مماثل ہیں۔ یوسفی کے ہاں یہ تینوں صورتیں ملتی ہیں پھر بھی انہوں نے اپنی تخلیقات کو نہ تو فلسفہ بننے دیا نہ علم الکلام۔ نکتہ سنجی غالب کے یہاں معنی آفرینی کا سبب ہے تو یوسفی کے ہاں تبسم کے شگوفے کھلانے کا۔۔۔''

فن کو اتنی گہرائی سے سمجھنے کی ایسی مثالیں آپ کو کم کم ہی ملی ہوں گی۔

اپنی ایک اور کتاب 'معنی کا گمان' کے اندر 'فکشن ناٹ ہسٹری' مضمون میں یہ تجزیہ دیکھیے،

''دراصل قُرۃ العین کے ہاں تاریخ، فلسفہ، مِتھ، عقائد، اوہام،

الٰہیات وسریات، فنون لطیفہ، جمالیات اور مختلف علوم آپس میں اس طرح آمیز ہو جاتے ہیں کہ ادب پارہ فلسفے کی سی بصیرت اور تاریخ کی سی عبرت کا سامان فراہم کرتا نظر آتا ہےتو تاریخ ادب کا سا لطف دیتی نظر آتی ہے۔اس تخلیقیت کے سبب ناول چاندنی بیگم کی مختلف تعبیریں ممکن ہیں ۔ یہ بظاہر قنبر علی، بیلا رانی اور چاندنی بیگم کی عشقیہ ثلیث اوران کی اموات کا اور بعد کو پنکی، ڈنگی اوروکی کی سرگرمیوں کا بیان نظر آتا ہے۔لیکن حقیقت میں تاریخ اوروقت کے ہاتھوں معاشرتی اور تہذیبی اقدار کی تبدیلی نہیں، جینے کے اُسلوب کے بدل جانے سے بھی عبارت ہے۔تہذیب ومعاشرت جس کی تشکیل ہنداسلامی معاشرت اور کولونیل جاگیردارارانہ اقدارنے کی تھی اور جس کا لسانی اظہار یا پیرایہ زبانِ اردو تھی۔''

اسی طرح دوسرے ایک مضمون 'غالب کا شعورِ مرگ' مضمون کا موضوع جیسا انوکھا ہے، اقتباسات بھی ایسے ہی حیرت انگیز ہیں۔مخدوم محی الدین پر لکھے مضمون 'شاعرِ شکست نور وصدا' میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ 'مخدوم کے ہاں جدید طرزِ احساس کی بھی نظمیں ملتی ہیں۔اگر چہ ان کی تعداد نہایت قلیل ہے۔حق تو یہ ہے کہ مخدوم کی فکر ہو کہ اُسلوب، ان کے ہر مجموعے کی اشاعت کے ساتھ بدلتا گیا ہے۔ان کا پہلا مجموعہ 'سرخ سویرا' ترقی پسندی سے عبارت ہےتو دوسرا مجموعہ 'گلِ تر' رومان اور عشق ہے۔تیسرا اور آخری مجموعہ کلام 'بساطِ رقص' جدید تر احساس اور جدید تر اُسلوب کا حامل ہے۔یہ تبدیلی مخدوم کی ذہنی زندگی کی فعالیت یعنی نئی فکر اور نئے رویوں کو قبولنے کی صلاحیت پر دال ہے۔''

ایسا نہیں کہ اردو میں تنقید لکھنے والوں کی کمی ہے۔ بہت لوگ لکھ رہے ہیں۔روایتی انداز سے بھی اور غیر روایتی انداز سے بھی۔اپنے اپنے طور پر دونوں ہی انداز دلچسپ ہوا کرتے ہیں۔مگر اگر کوئی تحریر پڑھنے کے بعد آپ کے ذہن پر

نثر کی لطافت کے ساتھ ساتھ روایتی چیزوں کے نئے مفہوم بھی اپنی جگہ بنالیں تو جان لیجیے کہ آپ نے ایک کامیاب تحریر پڑھی ہے۔سرحد پار یا ملکِ عزیز میں اردو تنقید کے کئی اہم نام آپ کی نگاہوں سے گزرتے ہوں گے۔موجودہ دور کی اکثر تنقید ہمارے یہاں غیر ملکی تھیوریوں کے زیرِ اثر 'اردوائز' کر کے لکھی گئی ہے۔ذاتی طور پر مجھے پروفیسر وارث علوی کی تنقید پسند ہے۔جہاں ایک جملے میں نئے استعارے کے ساتھ آگہی کا جادو زبان و بیان کے سحر سے آپ کو مسمرائز کردے، ایک اقتباس میں اردو ادب کی طاقت اور معنی آفرینی کے معجزے عیاں ہو جائیں اور ایک مضمون کے اندر ملکی اور غیر ملکی ادب کے ایسے دُرِ ہائے نایاب سامنے نمودار ہوں کہ قاری اسے یادداشت کے تاج میں سب سے اوپری تزئین کے طور پر سجا لے جو بھولے سے بھی نہ بھلائے جائیں۔ پروفیسر خالد سعید اگر تنقید کے تئیں ایسے ہی سنجیدہ رہے تو تنقید کی تشنگی کی تشفی کے لئے ان کے پاس بڑا سرمایہ جمع ہو جائے گا کہ ان کے زیرِ سایہ کئی پھول سے طالبِ علم، علم کی خوشبوئیں بکھیرا چاہتے ہیں جن میں میری حسین وادی کے چاند سے بچے بھی شامل ہیں اور وہ بھی جو میری کتابوں پر مقالے لکھ رہے ہیں۔

اس کے بعد ہمیں ڈاکٹر آمنہ تحسین نے اپنی دو کتابیں عنایت کیں۔ تحسین صاحبہ کی دونوں کتابوں کا کام قابلِ صد تحسین ہے کہ ایک کا عنوان 'حیدرآباد میں اردو ادب کی تحقیق' ہے جو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسری کتاب، 'تانیثی فکر کی جہات' جسے انہوں نے گمنام ادیباؤں کے نام کر کے اپنی حساس دلی کا ثبوت تو دیا ہی ہے، اس کے علاوہ مضامین میں ان کا اپنے انداز کا تجزیہ اور مشرقی نسائی ادب کو مشرقی عورت کے ذہن سے سمجھنے کے اپروچ نے، مردوں کے قلم سے لکھے گئے تجزیوں سے ذرا ہٹ کر اپنے لیے ایک الگ جگہ کا

تعین بھی کر دیا ہے۔ اپنے ایک مضمون، 'نسائیات' میں ڈاکٹر تحسین لکھتی ہیں،

'' 'نسائی ادب' کی اہمیت کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ صنفی تخصیصات کے تحت خواتین کے ادب کو دوسرے درجے کا ادب قرار دے کر نظر انداز کرنے کا سلسلہ عرصے سے جاری ہے۔ پدر سری نظام کے تعصبانہ رویوں نے نسائی ادب کے مطالعے کو ہمیشہ غیر اہم اور غیر ضروری خیال کیا۔ جس کے نتیجے میں بحیثیت انسان کے عورت کے مخصوص تجربات، اظہارات اور فکری انکشافات سے دنیا روشناس نہ ہو سکی اور نہ ہی کوئی سماجی مطالعہ مکمل ہو سکا۔''

ظاہر ہے کہ ایسی صداقتیں تحریر کرنے کے لیے قلم کار کا غیر متعصب ہونا نہایت ضروری ہے کہ ممتا محبت کے ساتھ ساتھ انسان دوستی اور رواداری کی بھی تربیت کرتی رہتی ہے اور یہ جذبہ ہر عورت میں پایا جاتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی اپنی گڑیوں کی اماں بنتی ہے اور اس میں خوش رہتی ہے بھلے ہی اپنا بیاہ نہ رچائے۔ مگر ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ صنف قوی میں ممتا کے ہونے سے ہی دنیا آباد ہے ورنہ انا پرست مردوں نے دنیا کو میدانِ کارزار بنانے میں کیا کسر چھوڑی ہے اور عورت کی نازک ہستی جبری تشدد کے آگے سوائے اشک باری کرنے اور دل کا عارضہ پالنے کے کر بھی کیا سکتی ہے کہ کسی بھی خطے کے معصوم باشندوں پر یکطرفہ جنگیں لا دی جاتی ہیں اور مرغزاروں کو گورستانوں میں بدلنے کا عمل جاری ہے۔ پروفیسر آمنہ تحسین نے خالص سچ لکھا ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا جانتی ہے کہ عورت ذات کی خداداد صلاحیتوں سے مرد اکثر ہی عدم تحفظ کا شکار ہوتا آیا ہے اور بلا سبب اسے اذیت دینا اپنا پیدائشی حق سمجھتا آیا ہے۔ دوسرے ایک مضمون، 'حیدر آباد کی خواتین محققین' میں کچھ یوں گویا ہیں کہ،

'' شہرِ حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کے علاوہ 'شعبہء اردو یونیورسٹی آف

حیدرآباد' میں سن انیس سو اسّی (۱۹۸۰ء) کے بعد سے اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں سن دو ہزار چھ (۲۰۰۶ء) سے سندی تحقیق کے لئے مقالات لکھے جانے لگے۔ ان تینوں یونی ورسٹیوں کے مقالات کی فہرست پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیقی پروگرام میں حصہ لینے والوں میں تقریباً پچاس فی صد خواتین شامل ہیں۔ ان کے مقالات اردو زبان و ادب کے اہم موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں جن میں لسانیات، ادبیاتِ تنقیدات، متفرقات اور دکنیات شامل ہیں۔ تمام مقالات اعلیٰ تحقیق کا نمونہ نہ سہی لیکن ان میں سے بیشتر مقالے اعلیٰ پائے کی تحقیق کا ثبوت پیش کرتے ہیں اس کے علاوہ جس اہم حقیقت کا بھی انکشاف ہوا ہے وہ یہ کہ حیدرآباد میں ڈاکٹر زور اور ان کے رفقاء نے دکنی ادب و تہذیب کی دریافت و بازیافت کا جو بیڑہ اٹھایا تھا اس کی پاسداری میں خواتین نہایت فعال اور کوشاں نظر آتی ہیں۔''

یہ محنتی اور فعال استاد صاحبہ خود بھی سیمینار اور دیگر ادبی کاموں میں مصروف نظر آئیں۔ ساتھ میں طلبا اور طالبات بھی ہاتھ بٹاتے ملے۔ ایک پرخلوص سا ماحول کہ انسان بس کتابوں کا ہو کر رہ جائے اور بوریت کا احساس تک نہ ہو۔ وہاں ہمیں شہر کی دوسری یونیورسٹیوں کے طالبِ علم بھی ملے۔ کچھ ہماری شاعری اور فکشن کی کتابوں پر تحقیق کر رہے تھے۔ وہاں کے تاریخ ساز اخبار 'سیاست' میں ہمارے کالم چھپا کرتے ہیں۔ اس نسبت سے بعض لوگ ملنے آئے تھے جن میں خواتین کی تعداد خاصی تھی اور اس بات کی خوشی ہوئی کہ اردو وہاں اپنی تمام تر عظمت اور اہمیت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

ایک افسانوی مجموعہ ' رحل' ہمیں کوثر پروین صاحبہ نے عنایت کیا۔ مجموعے کے نام ایسے شفاف سے چہرے والی کوثر پروین سادہ سے انداز میں اہم

بات کرنا جانتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ تانیثیت کو نعرے کے طور پر بلند نہ کر کے بھی مشرقی عورت صنف نازک کے صبر، تحمل اور استقلال کے اہم اور صحت مند نمونے پیش کرسکتی ہے۔جس میں بغاوت نہیں دردمندی ہوتی ہے۔لاتعلقی نہ ہوکر انسانیت ہوتی ہے اور امن کی خواہاں اس ہستی کے اپنے کام دوسروں کے مسئلے حل کرنے سے التوا میں پڑتے جائیں تو دل اندر ہی اندر کٹتا رہتا ہے مگر چاہے عورت کی ذہانت کو حالات کا جبر، رشتوں کے تقاضے اور ذمہ داریوں کا بوجھ کتنا بھی دباتے چلے جائیں، انہیں ابھر کر سامنے آنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔رحل کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں بڑے بڑے مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہیں ۔ افسانہ 'یاجوج ماجوج' میں بابری مسجد کے تعلق سے بچوں کے انصاف پسند ذہن کی مثال میں یہ سطور ملاحظہ ہوں،

''میرا اور پپو کا خیال ہے کہ پہلے یہ معلوم ہو کہ وہاں دواخانہ تھا کہ محل۔''

(کیوں کہ پنکی کی دانست میں بچے ہسپتال میں بھی پیدا ہوتے ہیں اور پپوٹی وی پر 'رامائن' کے حوالے سے جانتا ہے کہ رام چندر جی ایک بہت بڑے راجہ کے بیٹے تھے تو پھر محل میں پیدا ہوئے ہوں گے)

''اس لئے ہم وزیرِ اعظم کو خط لکھ رہے ہیں کہ اگر محل تھا تو مندر بنایا جائے اور اگر دواخانہ تھا تو نہیں کیوں کہ ہسپتال میں بہت سے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔''

سبھی جانتے ہیں کہ انسان فطرتاً معصوم ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ اپنے لئے اپنی ترجیحات کا تعیّن کرتا رہتا ہے مگر فن کار دانشور ہو کر بھی معصوم ہی رہتا ہے اور اس کا متوازن ذہن ساری زیادتیوں کا حل تلاش کرتے غلطاں و پیچاں ذہن میں اٹھتے نت نئے سوالوں کے بوجھ تلے دبتا ابھرتا رہتا ہے۔کوثر پروین کے افسانے بار بار اس بات کی یاد دلاتے ہیں۔

دو اور کتابیں ہمیں ڈاکٹر نگہت جہاں نے عنایت کیں۔ 'اردو شاعری میں تانیثی حسیّت' اور 'اردو ناولوں پر تقسیمِ ہند کے اثرات' پہلی کتاب کے مضامین کے عنوانات آپ کو باور کراتے ہیں کہ صاحبۂ کتاب نے کتنی محنت اور محبت سے یہ کام کیا ہے۔ مثال کے طور پر، 'عورت کا مرتبہ تاریخی پس منظر میں' یا 'اہم خواتین پر لکھی جانے والی نظمیں'، 'بیسویں صدی کی شاعرات'، اس کے علاوہ انیسویں اور بیسویں صدی کے شعرا پر مضامین۔

حرفِ آغاز میں ایک جگہ لکھتی ہیں، ' ۔۔۔ شاعروں کے دیوان، ناول نگاروں کے ناول، داستان گو کی داستانیں، غرض عالمی ادب کے بیشتر حصے کا موضوع، عورت رہی ہے۔ اسے دیوی کی طرح پوجا گیا، اس کے لئے دشت و صحرا کی خاک چھانی گئی ۔۔۔ اسے ارضی مخلوق سے سماوی مخلوق بنا دیا گیا ۔۔۔ (مگر) وہ کیا تھی؟ کس طرح محسوس کرتی تھی۔ کیا سوچتی اور سمجھتی تھی۔ اس کی خوشیاں اور دکھ کیسے تھے، رشتوں نے اسے کس طرح لہولہان کر دیا تھا، یہ کبھی کسی نے جاننے کی کوشش نہ کی ۔۔۔''

دوسری کتاب میں بھی ان کی ایسی ہی محنت، محبت اور ذہانت عیاں ہے کہ اردو کے بہت سے اہم ناولوں پر خوب بحث ہوئی ہے۔ جن میں قرۃ العین حیدر کے چار ناول، قاضی عبدلستار کے دو ناول اور انتظار حسین کے تین ناولوں کے علاوہ کرشن چندر، عبداللہ حسین، حیات اللہ انصاری کے ناول اور بعض دیگر اہم ناولوں پر مظامین ہیں۔

سن دو ہزار چار (۲۰۰۴ء) میں جب ساہتیہ اکادمی کی رکن ہونے کی حیثیت سے ہمیں چار سو دس (۴۱۰) صفحات پر مشتمل 'بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب' لکھنا پڑی تھی تو چھے برس کا عرصہ لگ گیا تھا کہ اس وقت تک

حضرات نے خواتین پر نہ کے برابر لکھا تھا۔ خوشی اس بات کی ہے کہ بعد کو ہندو پاک میں ہماری یہ کتاب بہت سی تحقیق اور تنقید کی بنیاد بنی اور ہم نے کئی جگہ اس کا اعتراف دیکھا مگر غم اس بات کا ہے کہ اگر مجھے آج یہ کتاب لکھنا ہوتی تو کام بہت آسان ہو جاتا کہ خواتین نے اب اس موضوع کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اچھا خاصا کام کر رہی ہیں۔

آخری کتاب بس کیمپس سے نکلتے ہوئے اس نوٹ کے ساتھ ہمیں عطا کی گئی کہ اپنی کتب انہیں بھیجی جائیں۔ یہ کتاب تھی ڈاکٹر حامد اشرف کی 'تزئینِ ادب' ڈاکٹر اشرف کے تحریر کردہ بہت سے مضامین کا یہ مجموعہ، حالی، اقبال وزیر آغا سے چلتا آگے جاتا ہوا، مختلف ادبی اصناف سے ہوتا لوک گیتوں کا احاطہ کرتا ہوا، شعر وادب کے نئے موضوعات پر لگن سے آگے بڑھتا ہوا کام ہے۔ اندازہ ہے کہ ادب کے تئیں ڈاکٹر اشرف خاصے سنجیدہ منصوبے رکھتے ہیں جن کی کامیابی کی پیشگی ضمانت ہم ان کی موجودہ کتاب کی خصوصیات کی بناء پر ابھی دیے دیتے ہیں کہ دوسری اہم اصناف سے ذرا الگ ہٹ کر ذرا مزاحیہ صنفِ سخن پیروڈی کے تعلق سے دیکھیے کہ کیا کہتے ہیں،

"پیروڈی یونانی ادب کی دین ہے۔ کسی کو ہدفِ ملامت بنانا اور اس پر طنز کرنا۔ پیروڈی کی خصوصیات ہیں۔ انگریزی ادب میں 'چاسر' کو پیروڈی کا موجد مانا جاتا ہے۔۔۔ پیروڈی مختلف خصوصیات کے پیشِ نظر اردو ادب میں اپنا مقام متعیّن کر چکی ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ صنف محض تفریحِ طبع اور ہنسی کا ایک ذریعہ ہے۔ ہنسی کی بنیادی وجہ مفکروں نے بے رنگی اور تضاد کو بتایا ہے۔ ہنسی کے ذریعے دراصل ہم اپنے غموں سے بدلہ لیتے ہیں۔ یہی ہنسی ادب میں پیروڈی کہلاتی ہے۔"

آگے ایک جگہ، 'راہی جمع غالب' کے عنوان کے تحت محولہ اشعار ملاحظہ کیجئے،

کل سے ہوں اک وزیر کو مہماں کیے ہوئے
'جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہو
اک قحط کے علاقے میں دورے پہ ہیں وزیر
'چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

ایک اور جگہ، 'راہی جمع اقبال' سے یہ سطریں ملاحظہ فرمائیے اور ڈاکٹر اشرف کے انتخاب کی داد دیجئے کہ،

کھول آنکھ یہ گھر دیکھ اور اس گھر کی فضا دیکھ
ہر کمرے میں اولاد کا اک سلسلہ سا دیکھ

ایسے ہی اور بھی کئی دلچسپ اور اہم سلسلے اس کتاب کی زینت بنے ہیں۔

ہم ڈاکٹر حامد اشرف کو اپنی کتابیں ہنوز نہیں بھیج سکے کہ ناشر صاحب میرے ناول 'برف آشنا پرندے' کا تیسرا ایڈیشن چھاپنا چاہتے ہیں اور افسانوں کی کتاب، 'میرا رختِ سفر کا بھی اگلا ایڈیشن آنے والا ہے۔ کتابیں ملیں گی تو سب کے گلے دور ہو جائیں گے کہ ادیب کو کتاب کے ذریعے اپنے فن کے کچھ معترف مل جاتے ہیں تو ناشر کو دولت، دونوں کا آپسی رشتہ حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا سوائے چند کتابوں کے۔ اور ہمیں بھی صبر کے میٹھے پھل کے طور پر اپنی کچھ کتابوں کا انتظار ہے۔

شیریں زبانِ اردو میں لکھی گئی ان اچھی اچھی کتابوں میں ایک اور اچھی بات یہ ملی کہ کہیں کہیں تاریخ ساز دکنی کا کوئی مہکتا سا لفظ ذہن و دل کو کچھ ایسے مسرت دے جاتا جیسے یونیورسٹی کیمپس میں کہیں سے خوشبوئیں لے کر آتے

ہوئے ہوا کے معطر جھونکے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ حیدر آباد میں اردو کے اچھے اساتذہ کی موجودگی معاصرین کے یہاں اچھی کتابوں کا جواز بنی ہے جس کا اعتراف کتابوں میں موجود ہے ورنہ پچھلی پانچ چھے دہائیوں سے اس کمی کے سبب آپ کو اس نسل میں اچھی اردو لکھتے ہوئے لوگ کم کم ہی نظر آئیں گے۔ بعد کی نسل کی تو بات ہی نہیں۔ اور یہ محبانِ اردو کی رنجیدگی اور مُسلسل اندیشوں کا باعث ہے۔ کہ،

'ہماری پیاری زبان اردو، حسین دلکش جوان اردو' دوسری زبانوں کو تو مالا مال کر رہی ہے مگر اس کی اپنی بقاء کی کیا صورت ہوگی، یہ بات سوچنے کی ہے۔

دروغ بافی

ہمارے جمہوری ملک میں عجب معاملے وقوع پذیر ہوا کرتے ہیں جن میں بعض زیادہ ہی حیرت ناک بلکہ ہیبت ناک ثابت ہوتے ہیں۔ ماضی قریب کے کچھ واقعات کی جانب نظر ڈالی جائے تو خبروں میں بار بار نظر آنے والی ایک تصویر بھولتی نہیں۔ کھچڑی داڑھی والے ایک قبائلی قائدِ قتل کے جرم میں سوئے زندان جاتے ہوئے انگلیوں سے وی (V) یعنی وکٹری کا نشان بناتے کیمرے کی طرف مسکراہٹیں پھینک رہے ہیں اور اپنی پارٹی کے ہجوم کو فاتحانہ انداز میں الوداع کہہ رہے ہیں۔ سیاست میں جرائم پیشہ افراد کی بہتات خاص کر ہمارے ملک میں کوئی نئی بات نہیں مگر حسّاس اذہان کے لئے ایسے مناظر سوہانِ روح ہو جاتے ہیں اور تصور سے مٹائے نہیں مٹتے۔ سن دو ہزار ایک کے زلزلے والے گجرات نے سن دو ہزار دو میں کیا کیا انسانیت سوز مناظر نہیں دیکھے۔ ایسی بلا جواز اور بلا اشتعال ہلاکتوں کو کیونکر تحریر کیا جائے۔ قلم ہے کہ کپکپاتا ہے۔

دروغ بافی کی زندہ مثالیں، یہ مصنوعی اور فرضی تصادم کچھ اس شکل میں میڈیا کے حوالے کیے جاتے ہیں کہ انسانی ہاتھ تھرا جائیں۔ کہتے ہیں نہ کہ جرم اور وہ بھی قتل کا، کبھی نہ کبھی منظر عام پر نمایاں ہو اٹھتا ہے۔ اور حال ہی میں آپ سب

نے بھی پھر ایسی تصاویر خوب دیکھی ہوں گی کہ ہمارے یہاں مجرمین کو سسٹم کے کرپٹ ہونے پر ایسا بھرپور اعتماد ہے کہ تلک لگوا کر اپنی آرتی اتروانا اور تصویروں کے ذریعے ایسے شرمناک واقعات کی تشہیر کروانا، نروان کی طرف ایک اور قدم کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور کیمرے کی جانب دیکھ کر ہاتھ سے 'وی' کا نشان بنانا تو گویا ان کا پیدائشی حق ہے۔ جیسے کہ عالمی پیمانے پر ملک کے لیے کوئی بہت بڑا تمغہ جیت کر وطن والوں کی وکٹری کا نشان بنا کر دکھایا جا رہا ہو۔ وہ بھی ایسے گھناؤنے جرم کی نسبت سے کہ جدھر کے سربراہ کو دنیا کی سیاست کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنے والے اور عالمی منظرنامے پر ایک پوری قوم کو شدت پسند ثابت کرنے کی مسلسل کوشش کرنے والی ایک بڑی طاقت نے بھی اس جرم کے سبب اپنی سرزمین پر پاؤں نہ دھرنے دیا ہو مگر یہاں پھر ایسے افراد کا کلین چٹ پا لینا عام انسان کو کنفیوز بھی کر دیتا ہے کہ یہ سیاسی سچائیاں بعض اوقات بڑی گھناؤنی ہوا کرتی ہیں۔

ذہن بار بار سوچنے پر مجبور ہوا اٹھتا ہے کہ کیا اتنے بڑے پیمانے پر اجتماعی غلطیاں ہو سکتی ہیں؟ اتنے جرائم بیک وقت ہو سکتے ہیں؟ اتنی بڑی تعداد میں مجرمین ایک ہی جگہ؟ کیا سیاست ضمیر جیسی کوئی شے باقی نہیں رہنے دیتی؟ اتنے مجرم زن و مرد جن میں ادھیڑ عمر، جوان اور نوعمر سب شامل کر لئے گئے تھے، جن میں اونچا طبقہ، متوسط طبقہ اور نچلا طبقہ بھی شامل رہا۔ خیر نچلا طبقہ تو ہوتا ہی ہے ہر سیاسی دُزد کی لوٹ کھسوٹ کا خام مال، مگر یہ نام نہاد اوپری طبقہ، یہ نو دولتیوں کا طبقہ کیسے اوپری کہلا سکتا ہے جب اس کے وہاں انسانیت اور تعلیم و تدبر کا ایسا فقدان موجود ہو؟

اروندھتی رائے نے اپنے ایک مضمون میں سوال اٹھایا تھا کہ اس طرح

کی یک طرفہ ہلاکتوں کے تئیں ایسا انسان دشمن ردِ عمل کیا مضر نہ ہوگا؟ یہ نسلیں جن کی ہر طرح سے حق تلفی ہوتی آرہی ہے کیا دہائیوں کے بعد بھی اس لائق نہ ہوں گی کہ اپنے حق کے لئے صدا بلند کریں، زیادتیوں کا جواز طلب کریں۔ بے گناہ جانوں کے زیاں کا حساب مانگیں۔ اگر حساب کا مطلب دو اور دو چار والا معاملہ ہے تو پھر اروندھتی رائے کا خدشہ آقاؤں کے لئے باعثِ تشویش ثابت ہوسکتا ہے۔ اسی ڈر سے سہی، کچھ تو ہو اور بعید از قیاس نہیں کہ منہ زور سیاسی پارٹیاں اس طرح کی تفتیش کو سیاسی داؤ پیچ سے تعبیر کرنے کی شرمناک کوشش کریں مگر اہم بات یہ انصاف کی جانب ایک قدم کا اٹھنا ہے جو ایک بڑی جمہوریت کی بڑی اقلیت کے مجروح اعتماد کے لئے ایک سہارا ہوسکتا ہے، بھلے ہی تنکے کا معلوم ہو۔ اور اب جب کہ Pandora's box کھلا ہے تو تمام گھناؤنے راز طشت از بام ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ چلن تو ہمارے یہاں عرصے سے عام ہے کہ اپنے کسی جرم کو چھپانے کی خاطر اور عوام اور ذرائع ابلاغ کی توجہ ہٹانے کے لئے کوئی قسمت کا مارا شکار کرلیا جائے اور ایک جھوٹی کہانی گڑھ لی جائے۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں، چھوٹی بھی اور بڑی بھی۔ ایک مثال اس شاپنگ مال کے 'تصادم' کی لی جاسکتی ہے جسے ایک معزز شہری نے میڈیا کے ذریعہ غلط ثابت کر دکھایا تھا (گو کہ بعد میں اس جمہویت پسند نیک انسان کی خیر خبر مشکوک ہوگئی تھی۔) کہ تصادم دراصل ایک فرضی تصادم کے ماہر کا سٹیج پلے تھا۔ بعد میں اس میں شامل ماہرین خود اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں ایک اور فرضی تصادم میں ہلاک کیے گئے تھے جس میں کچھ معصوم بے گناہ طلباء کی زندگیوں کا روشن چراغ آناً فاناً میں نہ صرف گل کر دیا گیا تھا بلکہ ان کے اعزّہ و اقربا اور ان کی آبائی سرزمین کے ہر فردِ بشر کو ملک دشمن ثابت کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی گئی تھی۔

کچھ برس پہلے ایک ذمہ دار کفن چور بلکہ coffins کی چوری کے معاملے کے گھپلے کو پس منظر میں ڈالنے کے لیے جمہوریت کی اہم ترین عمارت پر حملے کا منظر سامنے آیا۔ دروغ بر گردنِ راوی، جوکئی حوالوں سے بتاتا ہے کہ منظر سٹیج کیا گیا تھا اور قیدیوں کو موقع پر پہنچا کر ہلاک کیا گیا اور وہی فرضی تصادم والا معاملہ ظاہر کیا گیا۔ جس کے ایک ملزم کو مجرم ثابت کیا گیا اور وہ تختۂ دار کی جانب جایا چاہتا ہے جبکہ بات صاف نہیں ہے، بھلے ہی وہ کسی اور معاملے میں ملوث ہو، واللہ اعلم بالصّواب کہ کشمیری تو براہِ راست ایسی سازشوں کا شکار ہوتا آرہا ہے۔ ذمہ دار شخص کے لواحقین آجکل ان کے حواس کے علاج معالجے میں مصروف بتائے جاتے ہیں اور ان کے اعزّہ ان کی دولت کی خاطر ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔ بہر حال چاہ کن را چاہ در پیش کہ خدائے بزرگ و برتر کے یہاں اندھیر نہیں ہے۔ ان منصوبہ بند خونیں تماشوں سے تو عقلِ انسانی نے ہمیشہ پناہ طلب کی ہے، شرط یہ ہے کہ انسان پر شیطانیت کا غلبہ نہ ہو۔

جہاں تک نائن الیون کے حملوں کا تعلق ہے تو وہ اسی لیے وقوع پذیر ہوئے کہ 'وار آن ٹیرر' کی نام نہاد اصطلاح کا ایک جواز درکار تھا جو پیدا کر لیا گیا۔

US National Security Strategy 2002 کے دیباچے میں امریکی صدر بش نے لکھا ہے کہ 'ستمبر گیارہ نے ہمیں یہ سکھا دیا کہ افغانستان ایسے کمزور ممالک، طاقتور ملکوں کی ہی طرح ہمارے قومی مفاد کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔'

کوئی ان سے پوچھے کہ آپ لوگوں نے روسی طاقتوں سے لڑنے کے لئے افغانستان میں Drug Warlords کے ساتھ مل کر دہشت گردی کا جو جال بنا تھا وہ کیوں کر فراموش کر بیٹھے۔ کون نہیں جانتا کہ ان ملکوں کو امداد اور

قرضہ جات کی فراہمی اصل میں آپ اپنے ہی بزدلانہ مفاد کے لئے استعمال کررہے ہیں کہ آپ عالمِ اسلام کی ثروت مندی سے خائف ہیں (گو کہ بکاؤ لوگ وہاں بھی موجود ہیں) اور دنیا کے دیگر مما لک میں اسلام کے خلاف جنگ ہی آپ کا اصل مقصد تھا جس کی مثالیں ہندوستان میں TADA اور POTA کا اطلاق جس کی آڑ میں بے گناہوں کو ہراساں کرنا اور اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنا تھا یا کینیا کا Suppression terrorism Bill جس نے وہاں کے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا۔

بہر حال اقلیتوں کا اعتماد بحال، بلکہ اصل میں قائم کرنا ایک مثبت قدم ہے کہ کسی بھی ملک کی سیاست کچھ بھی کہے، عدلیہ کا ایک اپنا موقف ہوتا ہے۔جس پر ہر شہری کو اعتماد ہوتا ہے جبھی تو غیر جانبدار تحریروں اور تنظیموں کی وساطت سے عام آدمی پر حقیقتیں آشکارا ہو جاتی ہیں۔

اب اور باتیں جو مزید حیران کن ہیں کچھ ایسی ہیں کہ انصاف کی ایک اور تکلیف دہ شکل سے دوچار کرتی ہیں۔ وکالت جیسا پیشہ جو ڈاکٹر کی دوا کی طرح بے گناہ کی امید کا آخری مرہم ہوا کرتا تھا، اب گنہگاروں کے فرار کا پروانہ بن کر سامنے آرہا ہے۔تو ثابت ہوا کہ اس دور میں شہرت کا دوسرا نام رسوائی ہی ہے کیونکہ نامور وکالت، پیشہ ور قاتلوں بلکہ نسل کش افراد کو بے گناہ ثابت کرنا کامیابی کا باعث گردانئے پر تلی نظر آتی ہے۔اور تو اور اب ان جرائم پیشہ خوں خواروں کے ترکش سے عجب تیر نمودار ہوتے ہیں۔ابھی یہ لوگ مارے بوکھلاہٹ کے عجیب وغریب حرکات پر تلے دکھائی پڑتے ہیں۔ جیسے یہ کہ اپنے ایسے قتل خواہوں کو گول ٹوپیاں پہنا کر قاتلوں کے حق میں احتجاج کی تصاویر کھنچوا کر شائع کرانے کا کام بھی ہو رہا ہے۔یعنی جن پر ستم ہوئے وہ یہ کہیں گے کہ ستم گر کو سزا

ہی نہ دی جائے ؟ کوئی جواز نظر آتا ہے اس سینہ زوری کا؟ گویا انہیں بدعنوانی پر ایسا کامل بھروسہ تھا کہ انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ کبھی گناہوں کا شمار بھی ہو سکتا ہے۔ کہاں ہیں ایسی خباثت کی حدود؟ عقلِ انساں حیراں ہے، پریشاں ہے مگر بہر طور اپنی عدلیہ پر بھروسہ رکھتی ہے۔

☆☆
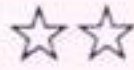
دسمبروں سے دسمبروں تک

سن بارہ (۱۲) کا دسمبر جاتے جاتے شہرِ دلّی کی حفاظتوں کی جو شکل چھوڑ گیا، اس سے ملک بیرونِ ملک کئی جگہ لوگوں نے اور خصوصی طور پر ہندوستانی باشندوں نے مظاہرے کیے۔ دلی میں جب لوگ سڑکوں اور احتجاجات کے روایتی مقامات جیسے انڈیا گیٹ یا جنتر منتر وغیرہ پر انصاف کے لئے امید کی شمعیں جلائے تین اور چار درجے سیلسی ایس میں راتوں کو بھی بیٹھے رہے تھے تو ہر دل میں یہی اندیشہ سر اٹھاتا رہا کہ ایسا کب تک چلے گا۔ کیوں بہت سے مقامات پر یہ باتیں خوف کی حد سے گزر کر بے بس غم کی شکل اختیار کر چکی تھیں کہ انہیں معلوم تھا کہ ملک کی باقی ریاستوں میں بھی ایسا ہوتا ہے، آبروریزیاں ہوتی ہیں اور قاتلانہ فطرت کام کرتی ہے۔

انگریز بہادر جو کہ کچھ ایسا بہادر کبھی ثابت نہیں ہوا، کے آنے سے قبل ہندوستان میں کبھی دنگے نہیں ہوئے تھے۔ آپسی رنجشیں انہوں نے ہی تخلیق کیں۔ آزادی کے بعد بھی کبھی فسادات نہیں ہوئے۔ جس جس سانحے کو فساد کہا گیا دراصل یکطرفہ بلوہ اور قتلِ عام ہوا کرتا ہے۔ طاقت ور سیاست نے بھوکوں کو ہتھیار اور آتش زنی کے آلات سے لیس کر کے اقلیتوں کی مظلوم بستیوں میں

لوٹ مار کے لیے بھیج دیا اور آدم کے وحشی بیٹے بربریت کی وہ تصویر بناتے گئے کہ انسانیت تھر تھر کانپتی رہی۔ ایسا بھی ضرور ہوا کہ بعض دفعہ یہ باتیں سامنے آئیں اور ملک کی جمہوری شبیہہ پر داغ ثابت ہوئیں مگر اس کو کیا کہیے کہ پھر بھی مودی ایسے لوگ انتخابات جیتنے کا اہتمام کراتے رہتے ہیں اور کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔ کئی دور دراز مقامات پر جہاں تہذیب کے نام نہاد رکھوالے کم کم ہیں، ایسا کم ہوتا ہے ورنہ اپنی روایتی پرانی تہذیب میں یہ سب اتنا بھی آسان نہیں ہے نہ کبھی تھا۔ ایسا پچھڑی ذات کے لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا چلا آرہا ہے اور ہماری حفاظتوں کے علم بردار ہیں کہ اجتماعی حملوں میں ظالم کے ساتھ مل کر غارت گری اور لوٹ مار میں برابر کے حصہ دار رہتے ہیں اور اگر کہیں امن و امان کے نام پر روانہ کر دیے جائیں تو دوگنی سے بھی زیادہ اجرت کے ساتھ ساتھ انہیں کسی نظم ونسق کا کوئی خوف بھی نہیں ہوتا اور یہ گاؤں کے گاؤں اجاڑتے عزت و آبرو پامال کرتے اِس بات پر کوشاں رہتے ہیں کہ ان کا تبادلہ واپس پہلی جگہ نہ ہو جائے اور یوں یہ گھناؤنا کاروبار جاری رہتا ہے۔ ایسے میں اگر مظلوم، پولیس کا در کھٹکھٹائے تو وہاں سے مزید بے عزتی کے ساتھ بغیر ایف آئی آر درج کیے باہر دھکیل دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ سلوک جو حال ہی میں نوئیڈا، اتر پردیش میں، جو دلی کی سرحد سے ملا ہے، تھانے والوں نے آبروریزی کی شکار لڑکی کی ادھ جلی لاش اٹھائے وارثوں کے ساتھ کیا۔ اتر پردیش ہو یا مدھیہ پردیش، اترانچل ہو یا ہماچل، اترا کھنڈ ہو یا جھارکھنڈ، ارونا چل پردیش ہو یا ناگالینڈ، منی پور ہو یا میگھالیہ، تری پورہ ہو یا گوہاٹی، ہریانہ ہو یا غازی آباد، نندی گرام ہو یا پٹنہ یا مشہور شہر یا ضلعے یا پھر وہ دیہات جن کو ملک کے نقشے میں اہم مقام نہیں ملتا یا میری زخم زخم حسین وادیٔ جنت نشان، یا شمال جنوب مشرق و مغرب کا کوئی مقام،

انصاف کا معاملہ تقریباً ایک سا ہی ہے اور وردی والوں کا سلوک بھی کچھ جدا نہیں ہے۔ بات گھوم پھر کر پھر قیادت ، سیاست اور حفاظت کے فرائض پر آتی ہے۔ آسانی سے تو جاہلانہ نفسیات بدلی نہیں جا سکتی۔ اس کے لیے تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ بے روزگار خالی الوقت افراد پر کام کی ذمہ داری جیسی مثبت چیزیں ضروری ہیں۔ اس ملک میں جہاں پچاسوں بولیاں، زبانیں، قبائل اور کلچر ہوں، منفرد انداز میں قدم اٹھانا ہی کام کر سکتا ہے اور ہر جگہ کی اپنی چھوٹی یا بڑی قیادت کام یاب ثابت ہو سکتی ہے جو کہ اپنے اپنے خطے کی روایات ، رسم و رواج ، زبان اور نفسیات سے بخوبی واقف ہو۔

دسمبر ہو یا جنوری بارہ مہینوں میں کوئی بھی مہینہ ہو، دنیا میں کہیں نہ کہیں ظلم ہو رہا ہوتا ہے۔ میری، ان سطور کو تحریر کرتے وقت بھی کہیں پر کوئی کسی کے حقوق کا استحصال کر رہا ہوگا، جان یا مال چھین رہا ہوگا آبرو یا خوشیاں لوٹ رہا ہوگا کہ یہ اشرف المخلوق چاہے تو بڑی آسانی سے اول درجے کی تخریب کار جاندار ہو جاتی ہے۔

کچھ روز پہلے مہاراشٹر کے دھولیہ علاقے میں ایک بار پھر نیم جاہل حفاظتوں نے آر ایس ایس ذہنیت سے مل کر آتشِ زنی اور اور لوٹ مار کر کے انسانی جانیں ضائع کیں اور علاقے کا سکون چھین کر خوف اور دہشت کا ماحول طاری کر دیا۔ کتنے داغ لگیں گے میرے ملک کی اس جمہوریت پر جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ مگر کہنا یہ تھا کہ دلی میں سولہ (۱۶) دسمبر کو ہوئے آبرو ریزی اور قتل کے معاملے نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ جہاں فرقہ واریت ، علاقائی تعصب اور جہالت اور نفسیاتی مریضوں سے پالا پڑ سکتا ہے وہاں ایسی با شعور نئی نسل بھی ہے جو انصاف کے لئے ہمہ وقت بیدار نظر آتی ہے کہ آبرو ریزی

اور قتل کی شکار لڑکی کا نام کوئی نہیں جانتا تھا اور لوگ تھے کہ یکجا ہو کر انصاف کی مانگ کر رہے تھے۔ کسی نے اسے 'نِربھئے' یعنی بے خوف لکھا تو کسی نے اسے 'دامنی' یعنی برق پکارا۔ شہرِ دلّی کی اس مثال سے دوسری جگہوں پر بھی لوگوں کے سوچنے پر اثر تو ضرور ہوا ہوگا۔ امید پر دنیا قائم ہے اور امیدیں جب علم وتدبر سے منسلک ہوں تو مثبت نتائج یقیناً سامنے آتے ہیں۔

لوگوں نے بیٹیوں کی دعا مانگنا چھوڑ دی ہے۔ گھر کا تصور ختم ہو جائے گا کہ فضا کے غیر فطری ہو جانے کا خطرہ بقائے انسانی پر منڈلا رہا ہے۔

اٹھائے رکھتی ہے نازک سی عورت بوجھ گھر بھر
لفافہ کاغذی جیسے سمیٹے رکھے سو چیزیں

(ت ر)

غنچہ ہائے ناشگفتہ اور لاحاصل انتظامیہ

بنی نوع انسان ہمیشہ سے ہی خبروں کے لئے مجتسس رہا ہے۔ ایلچی اور مخبر، منفی و مثبت دونوں طرح کے خبر رساں ہر دور میں اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ یہ اشرف المخلوقات جسے کچھ لوگ 'سماجی جانور' بھی کہتے ہیں، مسلسل اس بات کا خواہاں رہتا ہے کہ اُسے معلوم ہوتا رہے کہ اس کے اطراف کیا کیا ہو رہا ہے اور اُس کے اِس دنیا کا حصہ ہونے سے پہلے کیا ہوتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ اُس کے اِس 'آج' کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ بلکہ یہ تک کہ اُس کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کیا کیا ہوا کرے گا۔ خبریں اس کی تسکین کا، تو کبھی تکلیف کا سامان ہو جاتی ہیں۔ مگر اب خبروں کے تعلق سے کچھ ایسا دور آ گیا ہے کہ ادھر اخبار کھولا نہیں کہ گذرے حادثے ذہن پر یلغار کرنے لگتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو انسان کا دل بھی گرفتار ہو جاتا ہے۔ ایسی خبروں کے لئے تشنگی میرے خیال سے کوئی صحت مند علامت نہیں ہے کہ یہ بات خود کو اذیت دینے کے مترادف ہے۔ مگر اس سماج کا فرد ہونے کے ناطے اس شئے سے صرفِ نظر کرنا بھی سماجی بد دیانتی میں شمار ہو سکتا ہے۔

پچھلے ہفتے ایک ہی طرح کی خبروں نے کئی روز تک نگاہیں جکڑے

رکھیں۔ کہ شہر دلی سے لگے یو پی کی سرحد کے علاقے نوئیڈا کی سڑکوں پر گاڑیاں چھیننے والے سرگرم گروہ نے دو مختلف سڑکوں پر کئی حملے کیے۔ ایک رات کے حملے کے شکار ایک بزرگ تھے جو اپنے زخمی پیٹ پر بایاں ہاتھ دھرے کسی طرح ڈرائیو کر کے گھر پہنچ گئے اور بروقت طبی امداد سے خطرے سے باہر ہو گئے۔ اسی رات ایک اور حملہ ہوا تھا جس کا نشانہ ایک سابق ایر ہوسٹس تھی جو اپنے منگیتر کے ساتھ کوئی اور کام شروع کرنے والی تھی۔ اس نے گھر خرید لیا تھا اور اس کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ وہ کہیں سے لوٹ رہی تھی کہ چار موٹر سائیکل سواروں نے اسے گھیر لیا۔ پچیس سالہ لڑکی نے بڑی بہادری سے اپنی گاڑی کے شیشے کے قریب کھڑے دھمکا رہے ایک شخص کو گاڑی کا دروازہ زور سے کھول کر دھکا دیا تھا۔ مگر اس آدمی کے ساتھی نے اسی وقت لڑکی کے دل میں گولی اتار دی تھی۔

اور یوں ایک زندگی سے جڑے کئی زندگیوں کے خواب خاک ہو گئے اور میں ہاتھ میں اخبار لیے پتھر سی، اپنی آنکھوں کی نمی کو واپس جذب کرنے پر کوشاں لڑکی کی تصویر دیکھتی رہی، سانولا سلونا سا چہرہ، شانوں تک ترشے بال، عام سے نین نقش مگر خود اعتمادی اور معصومیت کا جاذب سا امتزاج ہوئے۔ آئے دنوں ایسی خبریں نظر آتی ہیں اور کچھ ایسا ہی ردِ عمل حساس اخبار بین کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو کچھ وقت بعد ایک تکلیف دہ سی کسک چھوڑتا ہوا پرانا تو ہو جاتا ہے مگر روز روز کی یہ خبریں انسانی نفسیات پر خاموش انداز میں ایک منفی اثر بھی ڈالتی رہتی ہیں اور اعصاب کو کمزور کرنے میں بڑا رول ادا کرتی ہیں۔

دوپہر تک سڑک کے حملے والی یہ خبر بھی عام دل دوز خبروں کی مانند نسوں میں تحلیل ہو کر لاشعور میں ٹھہر گئی تھی۔ مگر پھر کچھ ایسا ہوا کہ دوپہر ڈھلتے ہی ایک زندہ غم کی طرح میرے سامنے ایستادہ ہو گئی۔ اخبار میں نے حسبِ معمول 'لابی' کی میز پر

رکھوا دئے تھے کہ سب کمروں کے دروازے وہیں کھلا کرتے۔ میرا بیٹا اسی وقت امتحان دے کر لوٹا تھا اور کچھ لمحے بعد ہاتھ میں اخبار لیے اور چہرے پر ہوائیاں اڑائے میرے سامنے آگیا۔ ذہن ایک زخمی سی جست لگا کر تین برس پیچھے چلا گیا۔

وہ بھی ایک دوپہر تھی جب صاحبزادے تیز بخار لیے سکول سے آئے تھے۔ ڈاکٹر نے فون پر کوئی دوا تجویز کی تھی جو اتنی تیز نکلی کہ ان کا چھوٹا سا جگرا سے سہہ نہ سکا اور وہ پانی تک واپس اگلنے لگے۔ حیراں و پریشاں میں نے ڈاکٹر کو دوبارہ فون کیا تو انہوں نے کچھ اور دوا تجویز کی۔ کوئی فائدہ نہ ہوا اور شام تک بچہ بے حال ہو گیا۔ پھر کوئی چیز ہضم نہ کرنے کے علاوہ جب اُسے مسلسل ہرے ہرے سے پانی کی قے ہونے لگی تو میں سمجھ گئی کہ معاملہ اب قابو سے باہر جا رہا ہے۔ ڈاکٹر کو پھر فون کیا تو اس نے فوراً نرسنگ ہوم بلوالیا۔ میاں حضور شہر میں نہیں تھے۔ ضرورت سے زیادہ خوبصورت اور عمر سے کہیں بڑا نظر آنے والا، میرے بچے کا خوش وضع مگر محض سولہ سالہ وجود ایک سائڈ روم میں بے بس سا لیٹا میرے اندر بے چارگی پیدا کرتا رہا۔ اس کی لمبی سی بانہہ سے لگے بڑے سے ہاتھ کی ننھی سی نس میں ایک ظالم سی سوئی چبھی دیکھ دیکھ کر میرے ممتا بھرے دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔

آہنی پلنگ پر وہ لانبے لانبے ہاتھ پیر پھیلائے، بے بس آنکھوں سے جب جب میری جانب دیکھتا، تو مجھے ڈاکٹر کی لاپرواہی پر شدید غصہ آنے لگتا۔ اس کے تن و توش کو دیکھ کر ڈاکٹر اس کی کم عمری کی نزاکت کو کیسے بھول سکتا تھا کہ وہ دہائیوں سے ہمارا فیملی ڈاکٹر تھا۔ مگر یہ لوگ نئی کمپنیوں سے پرانی عادت کے مطابق معاہدے کر کے ہمیشہ مریضوں کی صحت داؤ پر لگاتے آئے ہیں۔ اس وقت میرے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ تھا لیکن میں اپنا غصہ اس کے فیملی ڈاکٹر ہونے کی مروّت میں نہیں دبا پائی اور اُسے اپنے بچے کی اس حالت کا ذمہ دار

ٹھہرایا اور وہ بھی اس کے نرسنگ ہوم میں، اسی کے اسٹاف کے سامنے، کیونکہ ظاہر ہے قلم کار،فن کار یا جو بھی سہی، بعد میں، پہلے میں صرف ایک روایتی ماں تھی، بچے کی تکلیف پر کبیدہ خاطر ہونے والی اور اس کی خوشی میں شادماں رہنے والی۔

اُدھر کئی دنوں سے ٹین ایجر صاحب اب دوستوں میں کچھ زیادہ مصروف رہنے لگے تھے، جس سے میں پریشان ہوگئی تھی۔ یہ تو چاہا تھا کہ وہ زیادہ وقت میرے پاس گھر پہ گزاریں مگر یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس طرح اسپتال میں آکر پڑ رہیں اور پھر مجھے مُوذی اسپتال کا کوئی ایسا تجربہ بھی نہ تھا۔

ان کے ہاتھ میں ڈرِپ لگا ہوا تھا اور میں ان کے پاس تھی۔ نرس نے دو ایک بار آکر کچھ ایک ایک گولی کھلائی اور گلوکوز والی ربر کی نلی میں ایک انجکشن داغ دیا۔ دل ذرا مطمئن ہوا کہ ایک چبھن سے انہیں نجات ملی کیونکہ ایک ہاتھ تو ان کا ویسے بھی بندھا تھا اور دوسرے میں موبائل فون تھا، جو مسلسل کان سے لگا تھا۔ ایک فون ختم ہوتا نہیں کہ دوسرا بج اٹھتا۔ ماں اپنے بچے کو اتنی اُبکائیاں لینے کے بعد پُرسکون سویا دیکھنا چاہتی تھی اور بچہ تھا کہ فون ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ 'کوایڈ' میں پڑھنے والے عمر سے زیادہ طویل قامت اور اکثر لڑکوں سے زیادہ پرکشش لڑکے کی مزاج پرسی لڑکیاں بھی برابر کیے جارہی تھی۔ کہیں خدا خدا کر کے یہ سلسلہ بند ہوا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ نرس نے بتایا کہ رات کو کوئی دوا نہیں دینا ہوگی اور ہم آرام کر سکتے ہیں۔ چھوٹے سے بلب کو روشن کر کے اور تیز بتی گل کرنے کے بعد میں دیوار سے لگے صوفے پر نیم دراز اس کے سوئی لگے ہاتھ کو دیکھتی، اداس اور نڈھال کئی کئی سوچوں میں غرق تھی۔ وہ سو گیا تھا۔ ہلکی پیلی سی روشنی میں اس کے ماتھے پر گرے آرہے گھنے بال، اس کی ستواں ناک کے اوپر، تین دن کے چاند کی ساخت کے اَبرووٴں کو چھو رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر اس کے بال

پیچھے کو سنوارے کہ نیند میں مخل نہ ہو رہے ہوں، اور اپنی جگہ آ گئی۔ اس کے ہاتھ پر جما ذرا سا خون میری رگوں میں بہتے خون کو منجمد سا کیے دے رہا تھا۔ یہ سب ایک ڈاکٹر کی لاپرواہی کے سبب ہوا تھا۔ اس خیال سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے جنہیں میں نے نتھنے پھلا کر اور دانت بھینچ کر پینے کی کوشش کی تھی مگر پھر بھی آہنی پلنگ کے رخ پر خمیدہ گردن کے سبب، بائیں جانب کو دیکھ رہی میری آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر میرے بائیں کان میں جمع ہو رہے تھے۔ دوپٹے سے کان پونچھتے پونچھتے کسی پہر میری آنکھ لگ گئی تھی کہ ہسپتال پر بھی سناٹا چھا چکا تھا۔ گہری نیند سے اچانک میں فون کی گھنٹی سن کر بیدار ہوئی۔

فون مریض کے لیے تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ رات کے سکوت میں صاف پتہ چلتا تھا کہ فون کسی لڑکی کا ہے۔ لڑکی بڑے تشویش ناک انداز میں اس کی خیریت معلوم کر رہی تھی۔ جب تک وہ بات کرتا رہا میں سوئی بنی رہی۔ پھر وہ جب چپ ہوا تو میں نے پوچھا کہ یہ کون لڑکی ہے جو اس طرح نصف شب کو فون کر رہی ہے تو اس نے کہا تھا کہ اس کے ایک کلاس فیلو کی دیدی کی فرینڈ ہے جو ایر ہوسٹیس ہے اور اسی وقت اس کی فلائٹ نے لینڈ کیا ہے۔

”اسے پتہ تھا کہ آپ بیمار ہیں؟“

میں نے جلدی سے پوچھا تھا۔

”نہیں اُس نے ویسے ہی ہائے کہنے کے لیے کیا تھا۔“

وہ تھکی تھکی سی آواز میں بولا تھا۔

”یہ کوئی ہائے کہنے کا وقت ہے۔“

میں نے ناگواری سے کہا تھا۔

”اوہ کم آن ماما۔ ڈونٹ اوورری ایکٹ پلیز۔۔ اب اس کی ٹائمنگس

ایسی ہیں تو کیا کرے۔''

وہ رک رک کر بولا۔

''عمر کیا ہے اس کی۔؟''

''شی مَسٹ بی ٹوئنٹی ون۔آئی سپوز۔''

''اتنی بڑی ہے آپ سے۔دیدی ہے آپ کی؟''

''نو۔۔شی از اے فرینڈ۔۔ہم چاروں فرینڈس ہیں۔۔میں ، میرا دوست،اس کی دیدی اور شیبا۔''

''اوکے بٹ شی شُڈ نٹ کال یو اِن دی رانگ آورس۔''

میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔وہ خاموش رہا پھر اچانک اس نے مجھے بلایا۔

''ماما۔مرے لیفٹ آرم کے پاس سارا بیڈ گیلا فیل ہورہا ہے۔شاید گلوکوز لیک کررہا ہے۔''

میں جلدی سے اٹھی اور بتی روشن کی۔اور جو میری آنکھوں نے دیکھا اس سے میرا سر زور سے چکرایا۔میں نے سر کو لمحے بھر کے لئے دونوں ہاتھوں سے تھاما پھر صورت حال سمجھنے پر دو ایک پل مزید صرف کیے۔

نیند میں کروٹ لینے سے گلوکوز والی سوئی اس کے ہاتھ کی اوپری جلد میں لگی نس کے اندر سے خبر نہیں کب نکل چکی تھی اور مسہری سے نیچے کو لٹکتے اس کے ہاتھ میں سے قطرہ قطرہ بہتا خون کمرے کے گوشہ کا بڑا سا حصہ سیراب کرکے اب ایک ننھی سی ندی کی شکل میں غسل خانے کی جانب بہہ نکلا تھا۔میرے گلے میں چیخ گھُٹ کر رہ گئی۔میں نے اسے ہاتھ اونچا رکھنے کی ہدایت دی اور باہر بھاگی۔نرسیں سو رہی تھیں۔انچارج نرس کاؤنٹر پر چہرہ دھرے اونچے اونچے

سانس لیتی خوابِ خرگوش میں گم تھی ۔ میں نے جگا کر صورت حال بتائی تو وہ جمائیاں لیتی خراماں کمرے کی طرف بڑھی۔

''نجرنہیں رکھا تا؟ مے بول کے گئی تی ۔ دیکھنا ہے سوئی کو۔''

وہ دیا سلائی سی دُبلی پتلی، جنوبی ہند کی ایک لاپرواہ لڑکی تھی۔

''آپ نے نہیں کہا تھا کچھ بھی۔ اور میرے بیٹے کا اتنا سارا خون بہنے دیا آپ لوگوں نے۔''

میں فرش پر خون کو دیکھتی، اچانک چکرا کر گرنے لگی تو کرسی پر بیٹھ گئی۔ جی متلانے لگا اور بدن پسینے میں نہا گیا۔ میرا جملہ سن کر وہ مجھے ناگواری سے دیکھ رہی تھی کہ الزام اُس پر نہ آئے مگر جہاں ڈاکٹر غیر ذمہ دار ہوں وہاں کی نرسوں سے کون سوال کر سکتا تھا۔ بہر حال پھر اس نے مجھے پانی پلایا اور سہارا دے کر صوفے پر لٹا دیا۔ اس اثناء میں فرش صاف ہو چکا تھا۔ بستر کی چادر بدلی جا چکی تھی۔ ڈرپ دوبارہ لگ چکا تھا۔ اور گل لالہ جیسا میرے بیٹے کا چہرہ نرگس کے ایک دن پرانے پھول سا ہو گیا تھا۔ میں خود سُن سی ہو کر رہ گئی تھی۔ دھل جانے کے باوجود کمرے کا سرخ کونا میری آنکھوں سے محو نہیں ہو رہا تھا۔ بہت سا خون نکل جانے سے نڈھال میرا بیٹا نیم غنودگی میں آنکھیں میچے لیٹا تھا۔ جب میرا ذہن رفتہ رفتہ کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو مجھے یکا یک خیال آیا کہ اگر رات کے دو (۲) بجے شیبا کا فون نہ آیا ہوتا تو میرے بچے کی نسوں سے جانے کتنا خون۔۔ اور پھر خدانخواستہ۔۔

اس خیال سے مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ شکستہ دل اور نڈھال دماغ کی ہر سطح پر اُس ان دیکھی مسیحا کا انجانا چہرہ ابھرنے لگا جس نے آدھی رات کو فون کر کے میرے بیٹے کی زندگی بچالی تھی۔ میں اپنے غصے پر شرمندہ اُس کی ایسی احسان مند تھی کہ اُسے تا عمر نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ میرے لئے رحمت کا فرشتہ

ثابت ہوئی۔ میں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگئی اور ندامت اور شکرانے کے آنسو میری آنکھوں سے جانے کتنی دیر تک رواں رہے۔

کچھ دن بعد بچہ تندرست ہوکر گھر آ گیا۔ گھر میں بہت سے تازہ گلابوں کا بڑا سا گلدستہ 'گیٹ ول سُون' کا کارڈ لیے لابی کی میز پر منتظر تھا۔ کارڈ کے گوشے پر تحریر کردہ لفظ 'شیبا' دیکھ کر میرا دل اس کے لیے جانے کیسی محبت اور کیسی کیسی دعاؤں سے بھر گیا۔ میں نے فون کیا۔

''کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں بیٹا۔۔ میرے بچے کی زندگی دوبارہ ملی ہے مجھے۔۔ تمہاری وجہ سے۔۔ تم کب فری ہو۔۔ ہمارے یہاں آؤ کسی شام۔۔ یا کبھی بھی۔۔ میں تمہارا یہ احسان کیسے چکاؤں گی بٹیا۔۔''

مجھے اپنے جذبات اس پر عیاں کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

''میں ضرور آؤں گی آنٹی۔۔ مگر آپ ایسا مت کہیں۔۔ میں نہیں فون کرتی تو اور کوئی فون کر لیتا۔۔ خدا نے اسے بچانا ہی تھا۔ آئی وِش ہم آل دی لک۔۔ میں بعد میں فون کروں گی آنٹی۔ ابھی جہاز ٹیک آف کرنے والا ہے۔؟'' وہ جلدی سے بولی۔

''اور آؤ گی کب میری گڑیا۔''

''میں فون کرلوں گی۔۔ بہت جلد۔''

اس نے فون رکھ دیا۔

انہیں دنوں میں نے اپنا نیا ناول، 'برف آشنا پرندے' شروع کیا تو ہم دونوں ماں بیٹوں نے ہیروئن کا نام متفقہ طور پر شیبا رکھ دیا۔ ادھر اس کی ڈیوٹی بین الاقوامی اڑان کی طرف منتقل ہوگئی اور وہ اور بھی زیادہ مصروف ہوگئی۔ میرے دل میں اسے دیکھنے کی اور بہ نفسِ نفیس اسے ڈھیروں دعائیں دینے کی تمنا پنپتی ہی رہی مگر میرے بیٹے کے ہر جنم دن کی صبح، اس کی طرف سے آیا بہت

سے گلابی پھولوں والا بڑا سا گلدستہ 'لابی' کی میز پر سجتا رہا۔ پھر کچھ وقت بعد اس کی زندگی میں ایک اچھا لڑکا آیا تو وہ اپنی دوست، اس کے چھوٹے بھائی اور میرے بیٹے کی منظوری کے بعد اُسے گھر والوں سے ملوانے پونا لے گئی۔ اب تین سال سے وہ اس کا منگیتر تھا اور اُن دونوں کی حال ہی میں شادی بھی ہونے والی تھی۔

امتحان سے لوٹ کر اخبار دیکھنے کے بعد جب میرا بیٹا چہرے پر دو جہاں کی رنجیدگی لیے سامنے آیا تو میں نے دیکھا کہ سانولے سلونے چہرے اور چمکتی آنکھوں والی جس لڑکی نے سینے پر گولی کھائی تھی وہ شیبا تھامس تھی۔ میرے دل میں کسی نے نیزہ سا چبھو دیا۔

اس ملک کا 'لا اینڈ آرڈر' کب تک ایسے ادھ کھلے گلابوں کی زندگیوں کے تحفظ میں ناکام رہے گا۔

میرے بیٹے نے کچھ دیر پہلے انٹرنیٹ پر شیبا تھامس کا، سڑک پر گرا خاکی جسم دیکھا تھا جس کے قریب ایک اُجڑا اُجڑا سا نوجوان اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ایستادہ تھا۔ اس نے مجھے تصویر کے بارے میں بتایا تو میری آنکھیں پھر بھر آئیں اور 'فائل فوٹو' والا سلونا سا مکھڑا میرے ذہن میں مسکراتا رہا۔

ناول میں اپنی ہیروئن کا رول آگے بڑھاتے، آج سے پہلے میرے اندر عجب سی ممتا موج زن رہا کرتی تھی۔ اب اس کردار کی تکمیل مجھے ہمیشہ رلایا کرے گی، خون کے آنسو۔

☆☆

حمام سوپ اور کھارا پانی

اپنی مٹی سے محبت انسانی شخصیت کا کتنا اہم جز ہے، یہ ہر بے وطن جانتا ہے مگر اپنے وطن کی ان جزئیات کی حفاظت کرنا جس کے لئے کوئی عملہ ترتیب نہ دیا گیا ہو، اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اپنے گھر آنگن کی، صحن کی یا اپنے باغیچے کی صفائی۔ یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اپنی وادی میں کم از کم ہم خود کو فخریہ طور پر مسلمان متعارف کراتے ہیں جب کہ باہر اب یہ بات بھی بعض اوقات متنازعہ قسم کی صورت حال پیدا کر دیتی ہے کہ خال خال ہی کوئی ذی عقل یہ سوچتا نظر آتا ہے کہ اصل ذمہ دار وہ ہیں جو بہ وُجوہ خائف ہو کر دہائیوں سے منصوبہ بند طریقے سے تباہیوں کے اسباب پیدا کرنے میں لگے ہیں اور اپنے بہروپیے بھیج کر کچھ بے ضمیروں کو خریدتے رہتے ہیں جو اپنی ہی شناخت کا سودا کرنا جانتے ہوں۔ اور بے سبب رسوا ہونے والے وہ ہیں جو اپنے تحفظ میں بجا طور پر شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر سب سے بڑی تعداد ان کی ہے جو اس صورتِ حال کا خمیازہ بھگتنے پر پریشان ہو اٹھے ہیں اور بار بار ان منفی ہواؤں کے تھپیڑوں سے پارہ پارہ ہوا کرتے ہیں۔ گو کہ اب ہوائیں کچھ ایسی چلنے لگی ہیں کی کنواں کھودنے والے اب سوچنے پر مجبور نظر آتے ہیں کہ کہیں چاہ کنوں کو چاہ درپیش تو نہیں۔

خیر بات یہ نہیں کہنا تھی، بات یہ ہے کہ اپنی اس سرزمین کے لیے ہم کو ایک بار پھر سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ ہم ایسا کیا کر سکتے ہیں جو مجموعی اعتبار سے اچھا کہلائے کہ ہمیں تو حکم ہی پاک صاف رہنے کا ہے۔ ہم صفائی سے سمجھوتہ کیوں کر کر سکتے ہیں؟ اس بات سے قطع نظر کہ ساری خرابیوں کی سیاسی صورتحال کیا ہے، ہمیں خود اپنی بھی خبر لینا ہوگی۔ اپنے آپ سے عام طور پر یہ مراد ہے کہ سماج میں بحیثیت فرد کیا ہم کسی دیانتدارانہ کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں اور خاص طور پر یہ کہ کیا کسی قسم کی طاقت کا ہم نے خود پسندانہ استعمال کر کے دوسروں کی تکالیف کے اسباب تو پیدا نہیں کر دیئے۔

کچھ روز قبل ملیشیا جانے کا اتفاق ہوا تھا جہاں کچھ عرصہ پیشتر ایک ذہین قائد نے ایک بڑے مستقبل کی بنیاد ایسے رکھی کہ وہاں پہنچ کر آپ کا دل حسرت سے سوچنے لگے گا کہ کاش آپ کو ایسے ہی ملک کا شہری ہونے کی سعادت حاصل ہوتی۔ اس طرح سوچنے میں کوئی قباحت نہیں اگر ہمارے اندر خود اپنے گردوپیش کو سنوارنے کا شوق پایا جاتا ہو اور ہم اپنے ملک کو ایسا بنانے کی کوشش میں جُٹ جائیں۔ مگر شہریت سے میری مراد وہ شہریت نہیں جو دوسرے ملکوں میں جا کر حاصل کی جائے اور دوسرے درجے کا شہری بن کر اپنی پہلے درجے کی فخریہ شناخت سے، جو صرف اپنے ہی وطن میں ممکن ہے، سمجھوتہ کر لیا جائے اور باقی ماندہ زندگی بعد کے وطن میں احساسِ کمتری سے اور پہلے ہم وطنوں کے تئیں احساسِ برتری میں یوں گزرے کہ بندہ گھر کا رہے نہ گھاٹ کا اور نا ستیل جیا کا شکار الگ ہو اور اس پر اگلی نسل کے کنفیوژن کے بھی اسباب پیدا کر دے۔

مجموعی صفائی اور پاکی کا صحیح تصور ایسا ہی ہوتا ہے کہ فرلانگ بھر کے فاصلے پر آپ کو وضوع خانے ملیں جن میں ہر وقت پانی ہو، صابن ہو اور جو نہ

صرف صاف وشفاف ہوں بلکہ کسی گوشے میں پھولوں کا ایک گل دستہ بھی مہک رہا ہو۔ مگر وہاں آپ نل کھلا نہ چھوڑ دیں اور فرش پر ضائع شدہ اشیاء پھینکنے کی بجائے کوڑے دان کا استعمال کریں کہ کوڑے دان ایک ایسی شے ہے جو لا پرواہ آدمی کو بھی زمین پر فضولیات پھینکتے وقت ایک آدھ بار سوچنے پر مجبور کرے گی۔ ہمارے معاشرے میں جیسے گھروں کے اندر صفائی اور نظم ونسق کا سارا کام عورت کے سپرد کر کے آنے والی نسلوں کو لا پرواہ بنانے کا چلن ہے ایسی کوئی بھی بات مجموعی صفائی کے شوق کی دشمن بنتی آپ کو ایسے شہروں میں دکھائی نہیں دے گی۔ بلکہ ملک کے دوسرے پہاڑی علاقوں میں بھی جیسے مسوری، موہالی، منالی وغیرہ میں، جن کی اقتصادیات کا دارومدار ایک بڑی حد تک سیاحوں کی آمدورفت پر ہوا کرتا ہے، آپ کو اپنے شہر کی طرح سڑکوں پر ضائع شدہ اشیاء کی بھرمار نہیں نظر آئے گی۔ جب غسل خانوں کی بہتات ہوگی تو آپ کو لب سڑک لوگ بے شرموں کی طرح بیٹھے یا کھڑے فارغ ہوتے نظر نہیں آئیں گے۔ اس طرح کوڑے دان اور وضو خانے سے گویا گندگی کی دو خاص وجوہات کا خاتمہ ہو گیا اور اس سے جڑی ایک اور وجہ کا بھی کہ سڑکوں پر لوگ تھوکیں گے بھی نہیں۔ اگر وضو خانہ، غسل خانہ یا بیت الخلاء قریب ہے تو اس میں واش بیسن آپ کو یہ سہولت بھی مہیا کرتا ہے کہ آپ منہ خالی کرنے کے بعد کلی کر کے دہانہ صاف بھی کر سکتے ہیں۔ انڈیا کے باقی علاقوں سے قطع نظر وادی ایک ایسی جگہ ہے جہاں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں۔ یہ خطہ خود شناسی، خود آرائی اور اپنی تہذیب اور کلچر کو ایک سنوری اور نکھری ہوئی شکل دینے میں ایک رول ماڈل کی طرح سامنے آ سکتا ہے مگر اسی صورت میں اگر ہم سب عوام وخواص سیاسی وسماجی کارکنان، تاجر اور افسر شاہی اور تمام طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے ماحول کی نوک پلک

سنوارنے میں دلچسپی لینے لگیں تو کام بٹنے سے پیسہ بھی بٹے گا اور بے روزگاری کا مسئلہ بھی حل ہوتا نظر آنے لگے گا۔ میرے دیش کی دھرتی سونا اور ہیرے موتی اگلتی ہے مگر خدا جانے وہ کہاں جاتے ہیں کہ غریبی بڑھتی ہی جارہی ہے اور میری اس وادی کی مثال بھی سامنے کی ہے کہ پانیوں کی صفائی کے نام پر آنے والی رقوم کسی خفیہ راستے سے جاتی بھی رہیں کہ نام ونشاں تک نہ نظر آیا۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اشتراکیت کا تصور اگر لادین ہو جانے کو اپنے ساتھ نہ جوڑتا اور جبراً لادا نہ جاتا تو شاید مسائل اتنے نہ ہوتے کیوں کہ خدا کے وجود پر یقین کا ہونا بھی انسانیت کے لئے ہی بہتر ہے کہ خدا کو تو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ بندہ اسے خدا سمجھے، یہ بات خود بندے کے ہی حق میں ہے۔

بہر حال مجھے ملیشیا میں سر اٹھا کر جی رہے مسلمانوں کو دیکھ کر خود پر فخر محسوس ہوا۔ کسی مقام کا سیاحت کے قابل ہونا بھی خدا کی طرف سے عطا کی گئی ایک برکت ہے جو اقتصادیات کا ایک بڑا حصہ سنبھال لیتی ہے۔ ہمیں بھی اپنے ان وسائل کی قدر کرنا ہوگی۔ وہاں سیاح حسبِ دستور اپنے میں مصروف و مسرور نظر آئے۔ سمندر کا ایک گوشہ تراش کر پانی کا رخ موڑنے سے تعمیر ایک مصنوعی جھیل کے کنارے جگر رنگ گنبد والی ایک بڑی سی پر شکوہ مسجد کے سامنے کچھ غیر ملکی اپنے ملکی ملبوسات میں رقص و فلم بندی میں مشغول تھے مگر مسجد کو اندر سے دیکھنے کے لیے انہیں ٹوپی لگا عبا نما لباس اوپر سے پہننے کو دیا جاتا۔ سب کچھ ایک نظم نسق سے ہوتا نظر آیا تو مجھے اپنی وادی کے چند دہائی قبل کے خوشحال دن یاد آنے لگے کہ دل میں کوئی کہہ رہا تھا کہ ایک دن وادی پر پھر ترقی اور روزگار کی بہار ہوگی اور صفائی ستھرائی کی بھی۔ وہ ملک سمندر کے کنارے ہے مگر نلوں میں کھارا پانی سپلائی نہیں ہوتا۔ اور ساحلی علاقوں والی طوفانی بارشوں کے پانی کے

نکاس کے لئے سڑکوں کے نیچے نالوں اور نالیوں کا جال بچھا دیا گیا ہے کہ نہ تو
کہیں پانی جمع ہو پائے اور نا ہی ٹریفک میں خلل پڑنے سے وقت ضائع ہو اور
حادثے جنم لے سکیں۔ اُس ملک کا ہر شخص محنتی اور تعلیم حاصل کرنے کا دلدادہ
ہے۔ اکثریت مسلمانوں کی ہے جو اپنی اقلیتوں سے محبت کرتے ہیں، انھیں
عزت دیتے ہیں۔ خدا کرے کے میرے بھارت کی اکثریت بھی ایسی ہو جائے
کہ میں نے حسین مسجدوں کے اس شہر میں ایک پر شکوہ پہاڑی کے دامن میں جو
'باتو' کہلاتی ہے، سونے کے خول میں مڑھا مورو گن (کارتکیا) بھگوان کا بلند
ترین مجسمہ دیکھا جو باتو کی غار میں سری سبرامنیا مندر کے سامنے ایک ہاتھ میں
نیزا لیے اور دوسرے سے بھگتوں کو آشیرواد دینے کے لئے ایستادہ ہے کہ وہاں
عرصہ پہلے جنوبی ہند سے ہجرت کر کے جانے والے لوگ اپنے بھگوان شِو کے
سب سے چھوٹے بیٹے مورو گن کو پوجتے ہیں۔ دور سے یہ مجسمہ بھگوان شِو کی
مورتی سا معلوم ہوتا ہے مگر اس کے گلے میں سانپوں کی مالا ہے نہ ہاتھ میں
ترشول۔ یہ مورو گن بھگوان کا اب تک کا دنیا میں سب سے بڑا مجسمہ ہے جس کی
نقاب کشائی جنوری سن دو ہزار چھ (۲۰۰۶ء) میں ہوئی۔ اسی طرح چینی نسل کے
لوگوں کی بھی اپنی عبادت گاہیں ہیں اور انہیں اپنے اپنے حقوق کا تحفظ بھی مہیا ہے۔

لوٹتے وقت بھی خوش رنگ پھولوں سے سجے چمن ایسے، ہر طرح کے
حسن سے مُزیّن اس ملک کے سَحر سے آزاد ہونا آسان نہیں تھا۔ وہاں کا ہوائی
اڈہ دنیا کے دو ایک حسین ہوائی اڈوں سے زیادہ حسین معلوم ہوا اور اس کے بعد
جہاز میں کچھ گھنٹے کے سفر نے بھی مسحور رکھا کہ وہ حسن بھی کم نہیں تھا۔ دریچے میں
آسمان تھا۔ ہلکا آسمانی آسمان پھر گہرا نیلا اور بیچ میں آسمان کی کچھ لکیریں فیروزی
بھی۔ بادل وسیع بحرِ ہند پر سایہ کئے دے رہے تھے جس میں دنیا کے کل پانی

کا بیس فی صد ہے اور جو کرہ ارض پر پانی کا تیسرا بڑا ذخیرہ ہے۔ جا بجا سرمئی، سفید، گدلے بادل بکھرے تھے۔اور جہاں کہیں ٹکڑوں میں بٹے ملتے وہاں ان کا سایہ پانی پر نظر آنے لگتا، ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا۔ بادلوں کے پہاڑ سے فضا میں تیرتے بھی ملا کرتے، سرمئی بادل سفید بادل اور سیاہ گھنے گھنے بھی، یعنی فضا میں رنگوں کی ایک دنیا رقص کرتی دکھائی دیتی تھی۔ سامنے مونیٹر پر زمینی رفتار کے مطابق سفر ہزاروں کلومیٹر فی گھنٹے رہتا اور باہری درجۂ حرارت بیسیوں درجے سینٹی گریڈ سے نیچے کی جانب بھاگتا تھا۔ گویا حرات کا دور دور تک پتہ نہیں۔ نقشے کی نشاندہی کرنے والا ننھا ساتیر گاہے اِدھر انڈمان نیکوبار کے جزائر کی جانب گھومتا، گاہے اُدھر ملیشیا انڈونیشا یا تھائی لینڈ دکھاتا اور گاہے سمندر کے اُس طرف نیروبی وغیرہ کا اشارہ کرتا۔ ان مناظر نے بھی کچھ دیر ذہن کو دیوانہ کیے رکھا۔ وہاں کے پرندے یاد آنے لگے جو ہمارے پرندوں جیسے ہیں مگر ذرا سے الگ بھی۔ ہماری عام شہری مینا بھی وہاں تھی مگر جسامت میں ذرا چھوٹی اور آواز میں بہت سریلی۔ کوے بھی ایک ذرا چھوٹے اور زیادہ چست نظر آئے۔ نیل کنٹھ یا شقراق زیادہ گہرے رنگوں والا اور کسی حد تک سُریلا بھی کہ عام طور پر شقراق چہکتے کم اور چیختے زیادہ ہیں۔ وہاں کے شقراق کی صدا چہکار ایسی تھی۔ عام گھریلو چڑیا بھی جسامت میں ذرا چھوٹی اور رنگ میں کچھ گہری تھی اور پپیہے سارا سارا دن بے سبب چہکتے تھے، گویا وہ اس سبب سے واقف تھے کہ ان کی صدائیں ایسی من موہنی اور جادو بھری ہوا کرتی ہیں کہ معلوم ہو کوئی دور نگر سے آپ کو یاد کر رہا ہے اور پردیس میں یہ صدائیں وطن سے آتی معلوم ہوا کرتی ہیں کہ ایک دو ایشیائی جو ملے ایسے خلوص سے ملے کے ان کی غریب الوطنی کا دکھ روح میں چیختا نظر آیا۔ اور گھاس پر اڑنے والے وہ باوقار سے نظر آنے والے ٹڈے جن کا رنگ یہاں ہرا ہوا کرتا

ہے وہاں سرخ رنگ کے تھے اور کچھ زیادہ بارعب معلوم ہوتے تھے۔ اس برکتوں والے ملک کے نرم تاثر چہروں والے لوگ اپنی اپنی دنیا میں مصروف و مگن زندگی کے معنیٰ اپنے طور پر تلاش کرتے مطمئن نظر آتے اور بار بار میری نظروں میں میری وادی کے عوام گھوم جاتے کہ خدا نہیں بھی احساسِ تحفظ سے نوازے اور روزگار و سکون کے وسائل مہیا کرے۔

گو کہ حاسدین، ملیشیا میں بھی بھیس بدل کر تاک میں ہوں گے کہ کسی طرح امن کی جھیل میں تشدد کا پتھر پھینکا جائے اور فضا میں زہر گھول دیا جائے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ سفید چہرے والوں کی کالی نظریں اس پر سکون خطے کی طرف نہ اٹھی ہوں مگر حکمتِ عملی اور ایمان و ایقان میں بڑی طاقت ہے، جو فروخت ہونے پر تیار نہ ہو اسے کوئی خرید نہیں سکتا کہ جذبۂ حب الوطنی بھی کسی عقیدے سے کم نہیں ہوا کرتا۔

دلِ غمزدہ کتنے ہی سوالوں کا جواب کھوجتا رہ جاتا ہے۔

ایسے میں اندیشوں کی جانب بھاگتے ذہن کو انسان بڑے عجیب تصورات میں گھِرا پاتا ہے اور کبھی کبھی آپ ہی آپ ہنس بھی پڑتا ہے۔

ایک بے تکا سا خیال مجھے بھی آیا تھا کہ کاش یہ ملک کسی بڑے سے ٹرک کی طرح ہوتا تو ہم اس ٹرک کی رنگین پشت پر کالے روغن سے 'بُری نظر والے تیرا منہ کالا' لکھ کر یا سینگ والے راکھشس کی زبان لٹکائے خون کی پیاسی شکل بنا کر دل کی کچھ تسلی کر لیتے۔

وہاں ہمیں خواتین بڑی سنجیدگی اور فخر سے اقتصادی ماحول کا ایک مضبوط اور بڑا حصہ تعمیر کرتی نظر آئیں، اپنے یا مغرب نما ملبوسات میں، سروں پر رومال باندھے نرم نرم تاثرات والے چہرے لیے پھول سی لڑکیاں۔

اور ہاں خدا ان آوارہ کتوں کو غارت کرے جو ہماری سڑکوں پر باقاعدہ

گروہ بندی کر کے کود پھاند کرتے اور گردن تانے ڈرانے پر تیار نظر آتے ہیں، وہاں ایک بھی نظر نہ آیا، شکر ہے۔

عجائب گھر، عمارات، شاہراہیں اور باغیچے ایسے کہ دیکھ کر دل ہی نہ بھرے اور صرف اس لیے کہ ہر شے میں صفائی اور جمالیات کی تسکین کا بھرپور سامان کیا گیا تھا۔ کوالالمپُر کے نسبتاً نئے بسائے گئے حصے 'پترا نجایہ' میں جدید طرز کی عمارتیں، جدید ترین پل، مصنوعی جھیلیں دیکھ کر انسان، انسانی ہاتھوں کی کرشمہ سازیوں پر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ راستوں پر لگے قمقموں میں گلاب کی شکل کے فانوس کے اندر پھولوں کے زیرے کی طرح بلب اور برابر میں گلاب کے غنچوں کی شکل کے لیمپ شیڈس میں کلیوں کی طرح نصب چھوٹی بتیاں نظر آئیں۔ کہیں کہیں سڑکوں کی منڈیروں پر سبزے کے اندر تراش کر مقامات کے نام ایسے تحریر کیے گئے تھے جیسے کسی نے ہرے کاغذ پر گہری سبز تصویر بنائی ہو۔ پرانے پُرشکوہ درخت نہ صرف محفوظ رکھے گئے تھے بلکہ اور زیادہ ہریالی کے اسباب بھی جاری تھے۔ ہوٹیل پام گارڈن کا گولف کورس، سرینگر کے رائل سپرنگز گولف کلب سے کم حسین نہیں تھا۔ اس ساحلی خطّے پر ایسی مستقل بہار ہے کہ خزاں کا موسم چھونے نہیں پاتا۔ پیلے رنگ کے چند ایک خزاں رسیدہ پتے مشکل سے ہی کسی گوشے میں کبھی دکھائی دے جاتے ہیں۔

(اس بات میں بھی ہم اہل وادی نے سُستی کا جواز تلاش کرنا اپنا بے جا دفاع بنا رکھا ہے، اگر یوں ہی دیکھا جائے تو دنیا کے اور سرد علاقوں کے باشندے اور بھی توانا و چست معلوم ہوں گے (بلکہ چالاک بھی کیوں کہ وہ بہانے بنا کر کاہلی کو نہیں اپناتے۔)

ہم لوگوں نے اپنے بچوں کی تفریح کی جانب بھی کوئی اہم قدم نہیں اٹھایا۔ مثال کے طور پر پرندوں کے باغ تو آپ نے سُنے ہوں گے مگر مختلف

نسلوں کے ایسے سدھائے ہوئے پرندے نہیں دیکھیں ہوں گے جو ایک ہی جگہ رہ کر اپنے مالک کے کہنے سے آنے والے کے سر بازوؤں اور شانوں ہاتھوں پر بیٹھ کر کیمرے کو پوز دیتے نظر آتے ہوں۔ اُلو سے لے کر مینا، فاختہ، چڑیں اور کئی کئی قسم اور جسامت کے توتے بڑے وقار سے ہر حکم ایسے مانتے نظر آتے کہ ان کے محکوم ہونے کا شائبہ تک نہ ہو کہ وہ اصل میں کسی پنجرے میں قید نہیں تھے بلکہ سدھائے ہوئے یہ سب پیارے پیارے پرندے ایک چھوٹی سی کھلی دکان میں رہتے ہیں اور کہیں نہیں جاتے۔ جاتے بھی ہوں گے تو لوٹ کر وہیں اپنے مالک کے پاس آتے ہوں گے اپنی حسین بولیوں میں گیت گانے اور سیاحوں کو متحیر اور مسحور کرنے۔ مور آپ کے سامنے ایسے رقص میں محو ہو جائے گا گویا آپ ہی کا منتظر ہو اور پنجرے ایسے کشادہ اور بلند کہ پنجروں والی کوئی بات ہی ان میں نہیں۔ پرندے خود کو پنجروں میں قید محسوس ہی نہ کرتے ہوں گے کہ باغ بڑا وسیع بھی ہے اور جالی کی چھت دور بہت اونچی۔ بچپن میں ہم نے کتنا کتنا وقت تتلیوں کو پکڑنے کی ناکام کوششوں میں گنوایا ہوگا مگر وہاں تتلیوں کا ایک حیرت انگیز باغ ہے جس میں تتلیاں آپ کو چھو چھو کر گزر جائیں گی۔

ان گنت رنگ و جسامت کی وہ ساری تتلیاں
نیلی پیلی سرخ کالی پیاری پیاری تتلیاں

(ت۔ر)

جہاں بچوں کی دلچسپی کا ایسا سامان ہو وہاں بچے کمپیوٹر اور ٹیلی ویژن سے چپک کر آنکھیں کیوں خراب کریں گے، اور یہ معاملے بالکل مشکل نہیں ہیں، بس ذرا شوق اور لگن کی بات ہے۔

بہر حال ایک اور دل چسپ بات یہ بھی تھی کہ حیاتین سے پُر مچھلی

خوروں کے اس علاقے میں مجھے ایک بھی عورت سن رسیدہ یا کمزور نظر نہیں آئی اور کسی بھی مرد کا سر گنجا نہیں دیکھا (اتفاق سے جن ایک حضرت کا سر بالوں سے خالی ملا وہ میرے ہی ہم وطن نکلے)۔

بھولے گا نہیں ہمیں وہ نم نم سا موسم اور ہریالی کی بہتات کے علاوہ جدید تکنالوجی سے سنورا اور خلوص وایمان سے سنبھالا گیا شفاف ساخطہ۔ خدا آباد شادر کھے۔ آمین!

مدراس ہوائی اڈے پر توڑ پھوڑ چل رہی تھی۔ خدا کرے یہ جلد تعمیر ہو جائے، دل نے دعا کی مگر دل سے ملکِ ملیشیا کا سحر نہیں گیا۔ چنئی میں کچھ گھنٹے رکنا تھا۔ ہم نے ایک گیسٹ ہاؤس کا انتخاب کیا۔ واش بیسن کے آگے ہاتھ دھوتے وقت نظر دریچے کی باہری طرف اٹھ گئی۔ ایک بڑے سے درخت پر انار سے مشابہہ سرخ مگر شگفتہ سے پھل نظر آئے۔ ذرا آگے کو جھانکا تو زمین پر بھی بکھرے ملے۔ بڑی پھلیوں ایسے بیجوں والے۔ غور سے دیکھا تو یاد آیا اسی شکل کے مگر قدرے چھوٹے درخت ہم نے ملیشیا میں بھی دیکھے تھے مگر ان پر پھل نہیں تھے۔ بھاری تنے کے جن کی ڈالیں پھیلی ہوں جیسے گوبھی کا کوئی قوی ہیکل پھول۔ اللہ جانے کیا نام ہوگا۔ سمندری علاقوں کے اپنے معاملات ہوں گے۔

اچانک خیال آیا کہ کتنی دیر سے ہاتھ دھونے کی کوشش کر رہی ہوں مگر جھاگ ہی نہیں بن رہا۔ دوبارہ صابن لگانے سے بن گیا۔ نل کھولتے ہی سارا جھاگ پل بھر میں محو ہو گیا اور اس کے باوجود اپنے دیسی حمام سوپ اور اپنے دیس کے کھارے پانی پر دل اپنائیت کے عجب جذبے سے سرشار معلوم ہوا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی کہ ملیشیا میں سب کچھ تھا سوائے اپنی سرزمین اور ہم وطنوں کے۔

☆☆

ہری جھنڈیاں اور خفیہ دستاویزات

سب سے بڑی جمہوریت کی سب سے بڑی اقلیت کی نفسیات پر یوں تو ساٹھ دہائیوں سے اُدھر کے عرصے سے پے در پے حملے ہوتے چلے آرہے ہیں اور یہ کوئی پوشیدہ قسم کی سچائی نہیں ہے مگر اب رفتہ رفتہ عدلیہ سے متعلق ملک کے مختلف شعبہ جات کی جانب سے اقلیتوں کا اعتماد بحال کرنے کی طرف اقدامات کیے جانے کی سعی عیاں ہوتی نظر آرہی ہے۔ بداعتمادی کا یہ عالم رہا ہے کہ عام ذہن خود کو سماجی سیاسی اور حفاظتی زاویوں سے بے بس پاتا رہا اور سوچنے والے اذہان اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا رہے کہ ٹاڈا، پوٹا، مکوکا اور اس طرح کے اور حفاظتی قوانین کے صریحاً غلط استعمال سے زندان بھرتے گئے۔ سوامی اسیمانند اور ایسے معاملات میں ملوث افراد کے خلاف کارروائی جہاں بے قصور قیدیوں کی آزادی کا پروانہ بن کر آسکتی ہے وہیں فہم و دور اندیشی سے عاری بعض حاکموں کے لئے چشم کشائی کا باعث بھی ثابت ہوتی نظر آتی ہے۔ گو کہ افسران اپنے محکمے کی خوبیوں اور خامیوں سے بخوبی واقف ہوا کرتے ہیں مگر اکثر اصل تخریب کاروں تک رسائی میں ناکامی کے سبب یا کسی مصلحت کے پیشِ نظر یا پھر خدا معلوم کون سے بغض و عناد کے زیر اثر مظلومین کو ہی مجرمین ثابت کرنے پر تلے

رہے۔ بہر حال ابھی شروعات میں اور اس طرح کے بیمار اذہان کے کیفر کردار تک پہنچنے کے دن تک کون کس بات سے پلٹ جائے ،کوئی کس معاملے میں مکر جائے اور آگے کیا ہو کون جانے کہ غیر قانونی ،غیر جمہوری اور غیر انسانی حرکات سننا ،سہنا اور جھیلنا روزمرہ کے معمولات کا حصہ ہو کر رہ گیا ہے مگر بہر حال انصاف کی طرف اُٹھتا ہر قدم قابل ستائش ہوتا ہے اور زخم خوردہ دلوں پر مرہم کا کام بھی کرتا ہے۔

خیر یہ تو وہ بات تھی جو سب کے علم میں ہے۔

کہنا یہ تھا کہ اگر منفی صفات رکھنے والے ایک انسان کا ضمیر بیدار ہوا تو ایک بے گناہ کے بچنے کا یقین پیدا ہو گیا۔ گویا میاں کلیم اگر اپنی خوش اخلاقی اور خلوص سے جیل میں اپنے ساتھی کو اپنی طرح بے گناہ سمجھ کر قتل وخوں کے خواہاں سوامی کا دل نہ جیتتے تو ایک ایسی حقیقت عیاں ہونے سے رہ جاتی جس کا منفی اثر حسبِ دستور نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کو جھیلتے رہنا تھا بلکہ عالم اسلام پر پے در پے لگنے والے اکثر و بیشتر بے بنیاد الزامات کی فہرست میں ایک مزید بدنما اضافہ بھی تھا۔ کتنی ہی جیلوں میں کتنے کلیم اپنے خدا سے ہمکلام ہونے کی کوشش کرتے قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے زندہ در گور ہیں۔ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ یہ دھماکے وہ دھماکے تھے جو محض اسلام دشمنی میں ہوئے اور اسے بم کے بدلے بم کا نعرہ بنایا گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس بم کے بدلے یہ بم نصب کیے گئے تھے۔ بے گناہوں کو راستوں اور گھروں سے پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ دینا اور پھر کیس solve کر دینے کا دعویٰ کرنے کے عمل کو کیا کبھی counter check کیا گیا۔ کیا بازاروں اور مندروں کے دھماکوں کے اصل خطا کار واقعی پکڑے گئے۔ کیا ان پر واقعی غیر جانبدارانہ انداز میں مقدمہ چلایا گیا یا محض مسلمانوں پر قہر نازل کرنے کے لئے خود دھماکے کیے گئے اور بے قصوروں کو

دھرلیا گیا۔ بم کے بدلے بم کی تو اصطلاح ہی غلط ہے۔ان دھماکوں کی بھی تو چھان بین ہو جن کا الزام اقلیتی فرقے کے افراد پر لگایا گیا اور قید کر لیے گئے کہ ابھی تک یہ سارے عجیب وغریب رجحان عام ہیں، درگاہوں کے قریب مسجدوں کی ہری جھنڈیوں کو پاکستان کا پرچم کہنا اور وہاں پڑھائی جانے والی اُردو کی کتب کو خفیہ دستاویزات بتانا۔ (مثال کے طور پر کرناٹک کا واقعہ) اور طلباء اور اساتذہ کو حراست میں لینا بڑا آسان کام رہا ہے۔ یہ روایت رفتہ رفتہ اتنی مضبوط ہوگئی کہ ملک کی جمہوریت پر شبہ اور ہندُتو حکمرانی پر تکلیف دہ یقین ہوتا نظر آیا۔ جہاں انسانی حقوق کے علمبرداروں (مثلاً تیستا سیتلواڈ وغیرہ) پر الٹا مقدمے چلائے جائیں، جہاں مدعی کو ملزم بنا کر قید کر لیا جائے (مثلاً ظہیرہ شیخ وغیرہ)، جہاں جھوٹے تصادم کی تشہیر کر کے معصوم طلبا کو قتل اور بے قصور افراد کو حراست میں رکھا جائے، وہاں انصاف پر اعتماد کے لئے نہایت ٹھوس بنیاد قائم کرنا لازمی ہے جبھی بات بنتی نظر آئے گی کہ ہندوستان کا مسلمان، ہندوستان کا جمہور نواز مسلمان، آزاد ہندوستان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے جان ومال کی بازی لگانے والا مسلمان، جس نے اسی ملک میں رہنا مُنتخب کیا تھا، مادرِ وطن کو ماں کی ہی طرح عزیز رکھتا ہے۔

انصاف کے پلڑے تو جب برابر ہوں گے جب مندروں، بازاروں اور اور دیگر مقامات پر ہوئے دھماکوں کی منصفانہ تفتیش ہو۔ تفتیش ہوئی تو وہاں بھی سوامی یا اس جیسی سوچ رکھنے والے ہندوتوادی افراد کی سیاہ کاریوں سے بھی پردہ اٹھے گا، یہ میرا نہیں ہر ذی عقل کا دعویٰ ہے۔

انسانی بقا کی خاطر

مجھے دو چیزیں بہت عزیز ہیں، پرندے اور بچے، بڑے معصوم ہوتے ہیں دونوں اور انسانی بقا کے لیے اہم بھی کہ ایک شئے زندگی ہے تو دوسری زندہ فضا کا استعارہ۔ مگر کئی باتیں ہیں جو ذہن سمجھتا ہے اور دل قبول نہیں کرتا کہ آخر اکثر سارا قہر اُن ہی لوگوں پر کیوں ٹوٹتا ہے جن کے چہرے بہت سفید نہیں ہوتے اور جن کے بالوں کے رنگ کم سفیدی مائل ہوا کرتے ہیں۔

دھواں پرندوں کے آشیانوں تک اتر آیا ہے۔ ان کی کئی اصناف نیست و نابود ہوگئی ہیں، بہت سی ہونے کو ہیں اور کرۂ ارض کے انگنت بچے ہر طرح کے تشدد کا آسان شکار ہیں۔

ایک تصویر دیکھی تھی کسی قحط زدہ علاقے میں کھنچی۔ ہڈیوں پر آبنوسی چمڑی پہنے جوان عورت کی گود میں پنسل جیسے ہاتھ پیر اور چھوٹی سی توند والے ایک ایسے بچے کی جو الومنیم کی اونچے، مڑے ہوئے کناروں والی رکابی سے نوالا اپنے دہانے کی طرف لے جاتی ہوئی ماں کو دیکھ رہا ہے۔ بچے کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ کئی دنوں کے لیے نیند اڑ گئی۔ آنکھیں بند کرتی تو وہ کھلی آنکھیں میری پتلیوں میں جاگ جاتیں۔ وہ منتظر آنکھیں، کہ ماں اُسے کب کھلائے گی۔ ماں

اُس سے پہلے کیوں کھا رہی ہے۔ اور کیا ماں کے پاس کھانے کے لیے کچھ اور ہوگا؟

وہ تصویر اب بھی یاد آتی ہیں تو وجود عجب بے بسی میں گھر جاتا ہے۔

ایک اور تصویر جو میرے تصوّر میں بیٹھ سی گئی ہے، وہ بھی بچے کی ہے۔ سیاہ گھنگھریالے بالوں اور گورے مکھڑے والا ، رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس چھوٹے چھوٹے ہاتھ ذرا سا آگے کو بڑھائے ، ایک خوبصورت سے مکان کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے پاس کھڑا ہے۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں آنسو لبالب بھرے ہیں (جو فوٹو کلِک ہونے کے لمحے کے بعد ہی چھلک گئے ہوں گے)۔ اس کی آگے کو بڑھی ہوئی باہیں کسی کے لیے کھلی ہوئی ہیں جو جلد آ کر اس کے دو ڈھائی سالہ وجود کو اپنی بے خطر گود کی پناہوں میں لے لے اور کہہ دے کہ کچھ نہیں ہوا اور پل بھر پہلے اسے نہلا کر خرگوش کے اون کا گلابی سویٹر پہنانے والی ماں زندہ ہے اور بابا اس کے لیے اچھی اچھی چیزیں لینے بازار گئے ہیں۔ اس کے بہن بھائی گولیوں کی ذد میں نہیں آئے اور سلیٹی رنگ پر بڑے بڑے ہلکے سبز دھبوں اور چھوٹی چھوٹی بھوری ٹیڑھی موٹی لکیروں والی وردی، ہیلمیٹ اور بہت سی بڑی بڑی جیبوں والی ہری نصواری جیکٹ پہننے والے بندوق برداروں نے زبردستی گھر میں داخل ہونے کے لئے اس کے گھر کا دروازہ نہیں توڑا۔

آگے بڑھی ہوئی اُن بانہوں کو کسی نے تھاما ہوگا؟ یا اسے بھی اس کے گھر کے لوگوں کے پاس بھیج دیا ہوگا۔ یا اس کے اعضا کا سودا کر لیا گیا ہوگا۔ یا شاید اسے کسی رضا کار تنظیم نے یتیم بچوں کے کسی کیمپ میں چھوڑ دیا ہوگا۔ جہاں وہ بہت دن تک روئے گا۔ اور بڑا ہو کر جانے کیا کچھ بن جائے گا۔

کچھ دن پہلے کسی ستم گر نے کچھ فارورڈ تصاویر ای میل کی تھیں۔ لباس

پر پیش بند باندھے اسکارف والی ایک خاتون ہاتھوں میں ایک نیم بے ہوش، تقریباً چار سالہ بچہ لئے دوڑ رہی ہے۔ دوسری تصویر میں اس کا کوئی عزیز بچے کو اس سے لیتے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عورت کے ایپرن پر لگ جانے والے خون کو دیکھ رہا ہے جو بچے کی کمر سے بہہ نکلا ہے۔ کچھ خواتین اور ایک ضعیف عورت سینہ کوبی کرتی ان کی جانب بھاگتی آرہی ہے جس کے عقب میں ایک پانچ چھے برس کا بچہ بھی دوڑ رہا ہے جس کے سُوئیٹر پر ننھے ننھے ڈائنا سور بنے ہوئے ہیں۔ تیسری تصویر میں گود میں لینے والا مرد آسمان کی طرف دیکھتا بلک رہا ہے۔ اس کے ڈھیلے پڑ چکے بازوؤں میں بچے کی بائیں جانب کو ڈھلکی گردن کے رخ پر سے دہانے سے خون اُمڈ کر بائیں کان کی طرف جارہا ہے اور بچے کی کھلی آنکھیں ساکت ہیں۔ آخری تصویر میں قالین پر رکھے چھوٹے سے جسدِ خاکی کے قریب جھکا ہوا دوسرا بچہ جس کے سُوئیٹر پر ننھے ننھے ڈائنا سور بنے ہوئے ہیں، زمین پر دراز بچے کی بے نور آنکھوں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ کلوز اپ میں نظر آیا کہ دیکھنے والے بچے کے چہرے پر دھماکے سے اُڑ آنے والے ریزوں نے خراشیں ڈال رکھی ہیں جن پر خون کی لکیریں جم چکی ہیں۔

ان تصاویر سے بھاگ کر کدھر جایا جائے۔

اس کہانی کی تصوریں کھینچنے والے کے دل پر کیا بیتی ہوگی اور اگر وہ زمین اور ہریالی کے ملے جلے رنگوں میں ملبوس باوردی بندوق برداروں کے ہاتھ لگ گیا ہوگا تو اس جرم کی پاداش میں اس کے جسم پر کیا گزری ہوگی۔ (میں سمجھتی تھی کہ خواتین امن پسند ہوا کرتی ہیں کہ خدا نے انہیں تخلیق کی عظمت عطا کی ہے اور دوسروں سے ممیز و ممتاز کر کے ممتا سے لبریز کیا ہے۔ گجرات میں عورتوں نے اپنی ہم صنفوں پر بھالے چلائے تھے۔ ابوغرایب میں ان کی ہم مزاجوں نے کوئی

کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ سوچتی تھی کہ وہ ذہنی مریضائیں ہوں گی یا شاید اس کے پیچھے طاقت کی بھوکی اور انا کی ماری مردانگی ہو کہ عورت کے خمیر میں اس ستم شعاری کی موجودگی ذہن قبول نہیں کر پاتا تھا۔ مگر اب کچھ سوچ نہیں سکتی کہ دنیا میں عجب طرح کے لوگ پائے جانے لگے ہیں)۔

کیوں یہ اشرف مخلوق طاقت پا کر یا طاقت حاصل کرنے کی خاطر خُوں خوار ہو جاتی ہے۔

اکیسویں صدی کے آہنی ڈائنا سور ہواؤں میں بے خوف وخطر آگ اگلتے پھرتے ہیں۔ دراصل اِن ڈائنا سوروں کو پالنے والوں کے لیے نسل کشی ہمیشہ سے ایک مشغلہ رہی ہے۔

بدنامِ زمانہ تجربہ جو ALABAMA کے سیاہ فام مفلس مریضوں پر سفید جلد والے نسل پرست ڈاکٹروں نے کیا تھا، چالیس سال تک جاری رہا تھا، انیس سو بتیس سے سن بہتر تک۔ ڈاکٹر جاننا چاہتے تھے کہ ان امراض کا علاج نہیں کیا گیا تو مریضوں کو کس کس طرح کی تکالیف ہو سکتی ہیں۔ انہیں پینسلین کی سہولت میسّر نہیں رکھی گئی اور یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ مہلک امراض دوسروں میں بھی منتقل ہو سکتے ہیں بلکہ یہ کہا گیا کہ ان لوگوں کے خون میں خرابی پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح بیماریاں پھیلتی چلی گئیں۔ اور لوگ تباہ و برباد ہوتے گئے۔

اور یہ بھی خیال ہے کہ پچھلی صدی کی آٹھویں دہائی میں افریقی امریکیوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے ایڈس جیسی مہلک بیماری کے جراثیم منظم طریقے سے ان سے متعارف کرائے گئے۔ اب ان کی بے بسی کا تماشہ دیکھا جا رہا ہے۔ جب ہی سے یہ خبریں بھی گاہے گاہے گشت کرتی رہی تھیں کہ یہ بیماری سیاہ فام نسل کو ختم کرنے کے لئے پھیلائی گئی ہے۔ بندر سے انسان میں آنے اور

افریقہ کے اندر بہت پہلے سے موجود ہونے کا پروپیگینڈا ابھی گویا جھوٹ ہی نکلا مگر پھر بھی شک کا فائدہ ملزم کو ہی پہنچتا رہا۔ وہی 'تیغِ منصف ہو جہاں دار و رسن ہوں شاہد'...والی بات!

یہی نہیں بلکہ ا۔ سے متعارف کرانے والوں کے پاس اس بیماری کا علاج بھی یقیناً ہوگا کہ اپنے تحفظ کا انتظام تو وہ کریں گے ہی اور اس علاج کو وہ نسل کشی جیسے اصول کے تحت دنیا میں عام بھی نہیں ہونے دیں گے۔

مگر آپ یہ باتیں ثابت کیسے کیجیے گا۔ جھوٹ اتنی دفعہ بولا جائے گا کہ سچ سمجھا جانے لگے گا۔ یہ بڑے بڑے حملے کئی بار پلانٹ کیے جاتے ہیں۔ بے خطاؤں پر الزام دھرنے کی خاطر۔ بھلا بغیر الزام دھرے قہر برپا کرنے والی اس طاقت سے کبھی کوئی باز پُرس کر سکا ہے۔ جو اپنے جیسے گناہ گاروں کی پشت پناہی بھی کرتی ہے۔ پھر بے قصور پکڑے جاتے ہیں۔ اور بے قصور ہی پکڑے جاتے ہیں۔

کیا ہمارا اپنا کوئی قصور نہیں۔ کیا خود ہم میں تعلیم کا فقدان نہیں۔ جہالت نہیں۔ کیا جن پر ہم تکیہ کیے بیٹھے تھے، (آخر کیوں کیے بیٹھے تھے؟)، وہ اپنی روغنی زمینوں کے نشے میں عیاش نہیں ہو گئے۔ کیا ہم میں ایسے نہیں جو بک گئے اور مذہب کے نام پر اپنی ہی نسلوں کو گمراہ کرتے رہے، معصوم زندگیوں کو بارود میں دھکیلتے رہے، یہاں تک کہ پوری قوم کی رُسوائیوں کا سامان پیدا ہو گیا، اور اسی بہانے نسل کشوں کو ملک در ملک ہلاکتوں کے منصوبے بنانا آسان ہو گیا۔ اور مزید آسان ہوتا جا رہا ہے۔

مگر کیا عام لوگ اتنے نادان ہیں کہ یہ چالاکیاں نہ سمجھیں، نہیں، عام لوگ نادان ہوتے تو یہ باتیں باہر ہی نہ آتیں کہ وہاں سے بھی احتجاج کی آواز بلند ہوتی ہے، چاہے سیاسی اپیروچ کچھ بھی ہو۔ وہاں سے انسانی حقوق کی پامالی

پر شور بھی مچتا ہے۔ مظاہرے بھی ہوتے ہیں۔

بڑی طاقتیں سازشیں کرنے میں لگی رہتی ہیں کہ صرف یہ خود محفوظ رہیں۔ مگر سیاسی فائدے کے آگے کسی شے کی کوئی وقت نہیں۔ کبھی کبھی اپنے کچھ افراد کی بھی نہیں کہ عمارتوں کے درمیان سے جہازوں کے گزرنے کی سوچ سمجھ کر بنائی گئی متحرک تصاویر کے آگے چھوٹی چھوٹی مسرتوں کے سہارے زندہ رہنے والا عام انسان دھوکے میں آ ہی جاتا ہے، اور طاقت کے سوداگروں کی صرف طاقت میں ہی دلچسپی ہے۔ جینوسائڈ کرنے میں انہیں کوئی برائی نہیں نظر آتی۔

طاقتیں عجیب عجیب کھیل بھی کھیلتی ہیں۔ بہت پہلے ایک فلم آئی تھی کہ کوئی سفید چہرے والا ادھیڑ عمر شخص، آنے والے دنوں کا حال بتاتا ہے۔ کتابیں چھپی تھیں کئی زبانوں میں۔ جو بھی اہم واقعات گزرے تھے ان کی پیشن گوئیاں ان کتابچوں میں اسی شخص سے منسوب کر کے درج کی گئی تھیں۔ اور جو نئے واقعات رونما ہوتے تھے، نئے ایڈیشنز میں ان کا اضافہ کر دیا جاتا تھا کہ فلاں ہستی کے قتل کی اس آدمی نے پیش گوئی کر رکھی تھی، اِس زلزلے کی، اُس سیلاب کی وغیرہ وغیرہ۔ اور آخری پیش گوئی یہ تھی کہ دنیا کے سب سے طاقتور ملک کے ایک اہم ترین شہر کو ریگستانوں میں بسی ایک بادشاہت کی تجربہ گاہوں سے بٹن دبا کر ختم کر دیا جائے گا۔ یہ بات ایسے جواز دے کر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ عام آدمی یقین کر لے اور اس کے دل میں ناپسندیدگی قائم ہو اور ایسا ہُوا بھی۔ مگر یہ سیاسی کھیل کھیلنے والے بھی تو انسانوں جیسے نظر آتے ہیں۔ کسی نہ کسی کے لئے تو وہ نرم گوشہ رکھتے ہی ہیں۔ لیکن سیاست اور انسانیت اب ایک جگہ نہیں نظر آ سکتی۔ یہ طاقت کا نشہ زہریلا ہوتا ہے۔ جو نشے کے شکار کو نہیں، دوسروں کو ہلاک کرتا ہے۔ یہ نشہ ہی ہے جو اِس وقت ایک مخصوص فرقے کے خلاف باقی دنیا

میں نفرت پھیلانے کا منصوبہ بند پروگرام چلا رہا ہے کہ ان زمینوں کے ذخائر پر قابض ہو کر مزید طاقت ور ہو جائے اور اس کے بعد ساری دنیا کو بھی اپنے قبضے میں کر لے۔

ابھی چار ایک صدی پہلے تک صدیوں سے آباد، ریڈ انڈین اب صرف تصویریں میں ہی نظر آتے ہیں۔ ان کے درمیان اُن مہلک بیماریوں کے کیمیاوی جراثیم لے جا کر پھیلائے گئے جن کے تئیں وہاں کے باشندوں کے اندر کوئی مُدافعتی نظام موجود نہیں تھا۔ انہیں خسرے اور چیچک جیسی بیماریوں کا کوئی علم تھا نہ کسی موسمی بخار کا تجربہ۔ اور ان کے قبیلوں کے قبیلے فنا ہوتے گئے۔ اصل النسل امریکی تو وہ ہی تھے جو اس خطے کے صدیوں پرانے باسی تھے۔ جنہیں سولہویں اور انیسویں صدی کے درمیان منظّم طریقوں سے ختم کیا جاتا رہا۔ پھر وہ نیٹو کہلائے (جیسے آزادی سے پیشتر برِ صغیر کے عوام کے لیے سفید چہروں والے لوگ کہا کرتے تھے)۔ ان Aborigines کو کولونلِسٹس کے ہاتھوں رفتہ رفتہ ختم ہونا پڑا کہ انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا جاتا، غلام بنایا جاتا، گھر چھوڑ کر کسی اور جگہ بسنے کو کہا جاتا پھر وہاں انہیں مختلف بہانوں سے قتل کیا جاتا۔ کیا تاریخ اٹھارہ سو اڑتیس میں ہوئے Trail of Tears کی اِصطلاح کو فراموش کر سکتی ہے۔ یا کیا تاریخ دان Wounded Knee Massacare جیسے واقعات بھول جائے گا۔ کیا عام انسان کے ذہن سے یہ چیزیں محو ہو سکتی ہیں۔ ابھی کچھ سال پہلے تک ان کے بوسٹن شہر میں داخل ہونے پر پابندی تھی۔ ایسے ہی جیسے کوئی چھے دہائی پہلے تک ہماری اپنی سرزمین پر تفریح گاہوں کے باہر Indians and dogs not allowed لکھا رہتا تھا۔

شملہ کے انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانس سٹڈیز کی گھنے جنگل سے گھری

پُرشکوہ عمارت کے کمروں میں ایک دیوار پر میں نے ایک تصویر دیکھی تھی۔ جب کی تصویر، جب فوٹو کھینچنا نیا نیا ایجاد ہوا تھا۔ٹم ٹم کے قریب صافہ پہنے کمر بند باندھے اپنی ہی سرزمین پر ایستادہ ایک نوجوان، ٹم ٹم سے اتر رہی ایک سفید فام خاتون کے قدموں کو اپنے ہاتھوں سے سہارا دینے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ٹم ٹم پر سوار دوسرے لوگ کسی بات پر ہنس رہے ہیں اور نوجوان کے وجیہہ گندمی چہرے پر مجبوری، احساسِ ذلت اور بے بسی کے ایسے تاثرات ہیں جو اُس زمانے کے کیمرے کی کمزور آنکھ سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکے۔

کون کس سمت کو جارہا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے اوباما کے آنے سے دنیا کا سیاسی منظر نامہ بدل جائے اور سکون کے خواب سچے ہوتے نظر آئیں۔ یا خاتون آئے اور انسانیت کو سیاست پر ترجیح دے دے۔ مگر کون جانے۔ سیاست دان اپنے ملکوں کی حکمتِ عملیاں کہاں تبدیل کرتے ہیں۔ بڑی ہمت چاہیے صدیوں سے رائج چلن بدلنے کے لیے اور بڑی صدق دلی درکار ہوگی خم دار راستوں کو صراطِ مستقیم کی جانب موڑ کر انسان کی بقا کی خاطر قدم بڑھانے کے لیے۔ضرورت صرف جذبۂ خلوص کی ہے۔

☆☆

خطائے مسلسل اور دیدہ دلیری

کچھ روز قبل صبح صبح اخبار میں ایک عجیب خبر پر نظر پڑی کہ کسی ادیب نے برسہابرس تک جاری اپنی بعض غلطیوں کا اعتراف کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی لگاتار جانتے بوجھتے ہوئے ایک خطا کیے جائے، تو کیا قدرت اس کی معافی قبول کرے گی؟ بندوں کی بات تو جانے دیجیے۔ خطائے مسلسل کی سزا اللہ میاں نے کچھ زیادہ نہیں رکھی ہوگی؟ یا پھر سزا کا احساس دیانت داری کے جذبے سے جڑا ہے کہ کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اسے سزا کی شدت بروقت محسوس نہیں ہوتی۔ اور بعد ازاں اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہ جاتا۔

وِدیا دھر سورج پرکاش نے اپنی سوانح لکھنے کا مختار انگریزی کے مقبول قلم کار پیٹرک فرینچ کو قرار دیا تو بہت سی باتیں منظرِ عام پر آئیں۔ برہمن نژاد وِدیا دھر کے خاندان نے انیسویں صدی کے آخر میں بھارت کے شہر اتر پردیش سے ٹرینی ڈاڈ (ویسٹ انڈیز) کے لئے ہجرت کی تھی۔ انیس سو بتیس سے دنیا میں آنے کے بعد جس وقت ان کا قلم، ناول اور سفرنامے لکھنے کے قابل ہوا تو پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ عالمِ اسلام کے خلاف زہر اگلنا اپنا اصول بنا لیا۔ اور اس جذبے میں وہ اس طرح غرق ہوئے کہ تحریر کے فنی پہلو فراموش

کر کے صرف ایک ہی موقف کے زیرِ اثر لکھتے رہتے۔ یہ بات بھی ایک اذیت ناک سچائی ہے کہ اس طرح کی تحریروں کے خریداروں کی تعداد اب ایک زمانے سے بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اس کی دل شکن مثال یہ ہے کہ پچیس برس تک نوبیل انعام کی طویل فہرست میں ابھرنے اور مختصر فہرست میں آنے سے پیشتر ہی ڈوب جانے والا، ودیا دھر سورج پرکاش نائپال کا نام بالاخیر نائن الیون کے صرف ایک مہینے بعد سن دو ہزار ایک کے ادبی نوبیل اعزاز کے لئے ان کی اسلام دشمن خدمات کے اعتراف میں موزون قرار پایا۔

سب جانتے ہیں کہ اس فیصلے کے خلاف دنیا بھر کے انسان دوست دانشوروں نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔

ایک بات پر میرا یقین ہے کہ اچھا انسان ہی اچھا فن کار ہو سکتا ہے کہ آوازِ خلق نقارۂ خدا ہوا کرتی ہے۔ اور ایسے متنازعہ فیہ قلم کاروں کی پشت پناہی میں، ظاہر ہے کہ سیاسی مفادات ہی کارفرما ہوتے ہیں۔ اس طرح کا ' غیر ادیب' جانتا ہے کہ اس کا کمزور ادب اسی بہانے بکے گا اور منفی ہی صحیح، شہرت حاصل کر لے گا۔ کیوں کہ اس کے ضمیر کی کوئی منصف مزاج طاقت، اس سے سوال نہیں کیا کرتی کہ وہ اس طاقت کو خود پرستی اور اغراض کے پیشِ نظر تھپک تھپک کر سُلائے رکھتا ہے، نہ پنپنے ہی دیتا ہے، اور نہ کبھی سینچتا ہی ہے۔ یہ الگ معاملہ ہے کہ خطا کے اِس اعتراف میں بھی موصوف کا، چونکانے سے شہرت حاصل کرنے والا وہی عمل پوشیدہ نظر آتا ہے جو نا کام ادیبوں کا خاصا رہا ہے۔

مجھے یہ بات نہیں کہنا تھی۔ میں تو اپنے برآمدے کے ایک پسندیدہ گوشے میں چڑیوں کا مشاہدہ کرتی چائے پی رہی تھی کہ اخبار کی سرخی نے اپنی طرف متوجہ کر لیا مگر پھر بھی میں نے الجھ الجھ کر سوچتے وقت نظروں کو بے خیالی میں

درختوں کے بیچ الجھائے رکھا۔ باغ کے کنارے ایستادہ نیم کا درخت پتوں سے خالی ہو رہا تھا کہ دو ایک روز میں ہی پھوٹنے والی ننھی ننھی کونپلیں جو ٹہنیوں کے کناروں پر اپنی نازک گردنیں اٹھائے اُبھرنے لگ پڑی تھیں، اسے پھر ہریالی سے لادنے والی تھیں۔ پتوں کے کم ہو جانے سے جہاں ٹہنیوں کی بنیادوں کے سہارے بُنے گئے کچھ گھونسلے واضح نظر آنے لگے تھے وہاں اور بھی بہت سی دلچسپ حقیقتیں مجھ پر آشکارا ہوئیں۔ مختلف نسل اور جسامت کی چڑیاں اپنے آشیانوں کے لئے نیم کے وہ تنکے توڑ کر لے جاتی نظر آئیں، جن کے پتے خشک ہو کر گر چکے تھے۔ یہ تنکے بھی رفتہ رفتہ جھڑ رہے تھے اور ایک اچھے نشیمن کی تعمیر کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ چھوٹی چڑیاں اپنی منی سی چونچ میں بڑی محنت کے بعد چھوٹی شاخوں سے لگے کچھ سوکھے ہوئے سے تنکے نکال کر اُن درختوں کے اندر کہیں لے جاتیں جنہیں ابھی ابھی بہار نے پتوں سے لاد دیا تھا۔ اور بڑے پرندے اپنی پرشکوہ منقار میں اپنے جثّے کے حساب سے بڑے تنکے چنتے۔ یہ ننھی ننھی جانیں اپنے گول گول پھولے ہوئے پیٹ لیے کئی دن تک ہر صبح مسلسل محنت کرتی نظر آتیں مگر کسی ایک بھی طائر نے نیم کی شاخوں میں پہلے سے بنے گھونسلوں میں سے ایک تنکا نہ چھوا تھا۔ گھونسلے کے مکین کی عدم موجودگی میں بھی نہیں۔ پرندے وہاں سے ایسے گزر جاتے جیسے چھوٹے بڑے سوکھے تنکوں کا گھونسلہ وہاں پایا ہی نہ جاتا ہو۔ ضمناً یہ بھی تحریر کردوں کہ اُدھر باغ کے بیچوں بیچ، دو نادان بلبلیں برقی کھمبے میں لگے قمقمے کے اندر ٹین کی چھت اور بلب کے شیڈ کے درمیان گھونسلہ بُننے میں منہمک نظر آئیں۔ بڑا دکھ ہوا۔ اتنی مشقت کے بعد جب رات کو بتیاں روشن ہوتے ہی حرارت کے سبب ان کا وہاں ٹھہرنا دوبھر ہو جائے گا تو کہاں جائیں گی کہ کون جانے کس نشیمن پر کب برق پاشی ہونے لگ

جائے۔ روح فرسا صدائیں پیدا کرتی ہوئی آگ اور چنگاریاں برسنے لگیں اور زمین پر پہنچتے ہی شعلوں میں بدل کر بستیاں اجاڑتی چلی جائیں۔

نیم کے درخت میں البتہ اپنی مرضی سے چھپتے ظاہر ہوتے طائروں کی ملکیت، اِن ٹہنیوں میں مجھے گلہری کی آمدورفت بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ تنے کے آس پاس اپنا گھوم گھام لیا کرے، چینٹیوں کے بلوں کی خبر لیتی، ان کے اناج کے ننھے ننھے ذخائر پر دھاوا بولتی یا موٹی ڈالوں سے لٹک کر کچی پکی نبولیاں کھایا کرے۔ پرندوں کی سلطنت میں گلہری کا بھلا کیا کام؟ نرم نرم پروں سے پرواز کرنے والی آسمانی کائنات کی بادشاہت میں، ہاتھ پیروں والے جانور کی موجودگی چہ معنیٰ دارد؟ مگر اب تو کسی کی بھی سلطنت پر کسی کا بھی کام نکل آنے کا کوئی بھی جواز نظر نہیں آیا کرتا۔ اور کام ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ بدنصیب خطوں کو تہہ و بالا کر کے بھی۔ خیر!

میرا ایک اور بات پر بھی یقین ہے کہ وہی انسان، انسان کہلانے کا حق دار ہے جس کا برتاؤ اپنے کنبے سے مشفقانہ ہو۔ جس کی زندگی کے رفیق کو اس سے کوئی گلہ نہ ہو۔ چاہے وہ اپنے شعبے میں کتنا بھی کامیاب کہلائے مگر ان باتوں کی عدم موجودگی میں وہ کامیابی ٹھوس نہیں ہوگی۔

وی۔ ایس۔ نائپال کی شادی سن اٹھاون میں پیٹریشیا نام کی ایک معلّمہ سے ہوئی تھی۔ اس کے تین سال بعد سے ہی موصوف نے بالا خانوں کی سیر کرنا شروع کر دی۔ اس بات کا علم ان کی شریک حیات کو نہیں تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ چالیس سالہ ازدواجی زندگی میں چوبیس برس تک ایک بیاہتا اینگلو ارجنٹائن عورت مارگریٹ گُڈر کے ساتھ نائپال کے تعلقات بھی رہے تھے اور اس بات کی خبر ان کی بیوی کو تھی جو کینسر کے مرض میں مبتلا ہوگئی تھی۔ کینسر اور شوہر

کی بے وفائی کو ایک ساتھ جھیلتی ہوئی پیٹریشیا کو جب ان کی اِس شرمناک عادت کا پتہ چلا تو اس کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور بالا آخر اس کی موت واقع ہوگئی۔ موصوف کو اعتراف ہے کہ ان کی بے اعتنائیوں کے باعث پیٹریشیا کی جان چلی گئی مگر اس کا کوئی پچھتاوا ان کے کسی طرز اظہار میں نظر نہیں آتا۔ بیوی کے بسترِ مرگ پر انہوں نے مارگریٹ سے تعلقات منقطع کر لیے اور اس کی آخری رسومات کی ادائیگی کے دوسرے روز اپنے دولت خانے پر پاکستان کی ایک مطلقہ صحافی خاتون کا استقبال کیا۔ پھر دو مہینے بعد ان ہی صحافی صاحبہ نادرہ خانم علوی سے وی ایس نائپال نے بیاہ رچا لیا اور وہ لیڈی نائپال کہلانے لگیں۔

پاکستان کے چوٹی کے کالم نگار خالد حسین نے وی ایس نائپال کی تحریروں کے فکری دیوالیہ پن کو ذہنی خودکشی سے تعبیر کیا ہے۔ موصوف کی شادی کے واقعے پر خالد صاحب کا دلچسپ فلمی جملہ کہ نادرہ اب ڈراکیولا کی دلہن بن گئی ہے، صحافتی حلقوں میں خوب مشہور ہوا تھا۔

نیم کے درخت اور باقی درختوں کے طیور کبھی ایک ساتھی کے ہوتے دوسروں کی تلاش میں نہیں رہتے۔ بعض پرندے تو مر جانے والے ساتھی کے غم میں کھانا پینا تیاگ کر جان دے دیتے ہیں۔ مگر میں اس شدت کے حق میں بھی نہیں کہ ربُّ الارباب کی عطا کی ہوئی زندگی لینا انسان کے اختیار میں کیوں کر ہو سکتی ہے۔ لیکن وفا بہر حال وفا ہے اور ایمان کا ایک حصہ بھی۔

"An Islamic Journey" اور "Among the Believers"

جیسے شدت پسند سفر ناموں کے مُحرِّر نائپال نے بابری مسجد کے انہدام کو جائز قرار دیا تھا۔ امن کے نام نہاد علَم برداروں کی طرف سے اس آدمی پر تیسری دنیا یا مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا الزام لگانا تو درکنار، الٹا

اسے انعام واکرام سے نوازنا بھی ایک پسندیدہ عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا گیا۔

یہ دو، کولونولائزڈ خطوں، ہندوستان اور ویسٹ اِنڈیز سے تعلق رکھنے اور انگریزی شہریت والے نائپال، کھلے عام سیاہ فام قوم کے خلاف بھی نسل پرستی کے مرتکب ہوئے ہیں مگر اس کا بھی کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسے ہی جیسے موصوف کی اسلام دشمنی کی کوئی وجہ پتہ نہیں چلتی۔ مغرب کی سفید فام نسل سے وہ خوامخواہ اس قدر کیوں متاثر ہیں کہ نہ تو وہ نسب سے مغربی ہیں نہ شکل سے سفید فام؟ (ہوسکتا ہے یہی سبب ہو) پھر یہ کس احساسِ کمتری کے شکار ہیں کہ ان کی غیر متوازن تحریر صرف ایک مخصوص ریڈرشپ کے لیے ہی ہوتی ہے۔ اور ان کا قاری وہی ہوتا ہے جس کا ادبی ذوق فرقہ پرستی کے اطراف گھومتا ہو۔ کسی بھی قلم کار کے لئے یہ بہرحال ناکامی کے ہی مترادف ہے۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی ایک تحریر میں انہیں اسی سبب سے 'دیسی مخبر' کا نام دیا تھا۔ انہوں نے بعض دوسرے اہم مصنفین کا ذکر کرتے ہوئے بنگالی مارکسی نظریے کے حامی امیتاو گھوش کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ادھر کچھ برسوں سے نائپال نے صرف اسلام کے خلاف ہی آگ اگلی ہے اور اپنے ہندُتوانہ خیالات کی تشہیر کا جشن منانے کی غلطی پر تُل گئے ہیں۔

وی ایس نائپال جیسے فرقہ پرستوں کی تند خوئی کیا انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں شمار نہیں ہوتی۔

کس سے پوچھا جائے۔؟

☆☆

جگر دو لخت دل مضروب آنچل خون سے رنگیں

باون سالہ ایلن پیکیز نے اپنے مختصر سے لٹے پٹے گھر کے گرد لوہے کے سریے نصب کروائے تھے کہ ایک بیس سالہ نوجوان اس کی زندگی کے در پے تھا۔ ایلن جنوبی افریقہ کے مشہور ڈاؤن ٹاؤن کیپ ٹاؤن سے قریب بیس منٹ کی دوری پر لیونڈر ہلز کے کیپ فلیٹس میں رہتی تھی۔ یہاں کی گلیوں میں منشیات سے متعلق گروہوں کا راج ہے کہ اسّی فی صد جرائم کا تعلق منشیات سے ہوتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں ہر پچیسویں منٹ میں ایک قتل ہوتا ہے۔ ایلین کے علاقے میں نشیلی اشیاء فروخت کرنے والوں گروہوں کے درمیان چھڑ جانے والی جنگ کی گولیوں سے بچنے کے لئے بعض اساتذہ بچوں کو زمین پر جھک کر بچنے کے گر سکھاتے ہیں۔ منشیات کا یہ چلن اتنی شدت سے کیسے عام ہوا اور اس کے اصل اسباب کیا ہیں اور یہ تباہی دراصل کس کے حق میں جاتی ہے اور ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے، ایک الگ بحث ہے کہ کرۂ ارض پر حکومت کرنے کے خواب لے کر چلنے والا کوئی طاقت ور ملک دوسری اقوام کی نسل کشی کے لئے ایڈز جیسے امراض اور میریجوانہ جیسے نشے آسانی سے عام کرا سکتا ہے اور کسی پر کوئی بھی الزام لگا کر تباہیوں کا جواز بیان کرسکتا ہے۔

بہر حال واقعہ یہ تھا کہ کچھ برس پہلے ایک گیارہ سالہ بچے ابی نے سگریٹ میں 'ڈُ گا' پینا شروع کیا تھا جو میریجوانہ کا افریقی نام ہے۔ چودہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اسے سکول سے نکال دیا گیا اور اُس وقت تک وہ اِس سے بھی زیادہ نشہ آور چیز استعمال کرنے لگا تھا جو مغرب میں کرسٹل میتھ اور جنوبی افریقہ میں ٹِک کہلاتی ہے۔ دہائی بھر قبل مغربی کیپ ٹاؤن میں ٹِک کا نشہ کرنے والے بارہ ہزار تھے اور اب یہ تعداد بڑھ کر ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب ہو گئی ہے۔

ابی نے بھی ہر نشے کے غلام کی طرح بے خبری اوڑھ لی تھی۔ وہ گھر والوں سے اولاً پیسے لے لے کر اور بعد میں گھر سے پیسے چرا کر یا چھین کر اور اس کے بعد گھر کا سامان چوری چھپے فروخت کر کے اپنا نشہ پورا کرتا یہاں تک کہ اُس نے مار پیٹ اور ڈرا دھمکا کر بھی کام نکالنے سے گریز نہ کیا۔ اس کا گھر کے اندر گھسنا بند کر دیا گیا اور وہ صحن کے ایک گوشے میں جھونپڑا ڈال کر رہنے لگا کہ اسے گرد و پیش کی اہمیت فراموش کیے زمانہ ہو گیا تھا۔ نشے کی دنیا کا جرم کی دنیا سے بڑا قریبی تعلق ہے۔ جوان ہوتے ہوتے تہذیب تمیز سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ نشے کے لئے وہ اپنی ماں کے کپڑے یہاں تک کہ زیر جامہ تک فروخت کر چکا تھا اور آس پڑوس میں ایک نیم جرائم پیشہ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ قتل ہونے سے ہفتہ بھر قبل اس نے اپنی ماں کے پاس تھوڑے سے بچے پیسے چھیننے کی کوشش کی تھی اور حاصل نہ کر پانے پر ماں کے گلے پر قینچی دھر دی تھی جب پھر اس کی ماں نے خوفزدہ ہو کر اپنی جان کے عوض وہ رقم اس کے حوالے کر دی تھی۔ اس بدنصیب عورت کو اپنی ہی اولاد سے اس درجہ خوف آتا تھا کہ اس نے گھر کے اطراف سریے نصب کروائے تھے کہ کون جانے اس کی اولاد رات کو آ کر بچا کھچا بچھونا تک فروخت کر دے اور ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش میں وہ ماں

کا کیا حال کر دے۔ خدا جانے کیا کیا خوف ہوں گے ماں کے دل میں کہ صرف ماں ہی یاد رکھے ہوئے تھی کہ نشے میں غرق وہ انسان اس کی اولاد ہے مگر بیٹے کو تو اپنا بھی ہوش نہ تھا۔ وہ نشے کی خاطر کسی کی جان لے سکتا تھا اور اس کے اعضا بیچ کر اپنی تشنگی مٹانے پر اسے دوسری بار سوچنے کی ضرورت نہیں پڑ سکتی تھی اور ایسی صورت میں ماں سے آسان شکار کون ہو سکتا تھا۔

یہ بات بھلے ہی کچھ زیادہ زیرِ بحث نہ رہا کرتی ہو مگر گھریلو تشدد کی شکار عورتیں مردوں کی وجہ سے ہی ہوا کرتی ہیں۔ جہاں ڈومیسٹِک وائلینس میں عورت کا ہاتھ ہوتا ہو، وہاں بھی دراصل مرد کی کم فہمی یا لاپرواہی کے سبب گھر میں زیادہ بااثر عورت نسبتاً کم اثر والی عورت کو اپنی انا کی تسکین کا سامان سمجھ کر زیادتی کرتی ہے جب کہ ایک عورت کا کسی گھر میں داخل ہونا مرد کے ساتھ جوڑے گئے رشتے کے باعث ہی ہوتا ہے تو یہ مرد کا ہی فرض ہے کہ ایسی ذمہ داری اٹھانے کا اعلان کرتے وقت وہ ذمہ داری کا معنیٰ سمجھتا ہو اور رشتوں میں توازن رکھنا جانتا ہو۔ گو کہ حضرتِ آدم نے اس حوّا کی بیٹی کو ہی غصہ ٹھنڈا کرنے کا آسان ٹارگیٹ سمجھ رکھا ہے کیوں کہ اللہ میاں نے اس صنف کو نازک بنایا ہے۔ وہ برابر کا غصہ، شور یا زورِ بازو کا مظاہرہ نہیں کرتی اور ہر قیمت پر امن و سکون کو ترجیح دیتی ہے اور کسی مسئلے کو انا کا مسئلہ بنا کر رائی کا پہاڑ نہیں بناتی اور سہتی ہے جن تک کہ صبر کا دامن چھوٹ نہ جائے۔ مگر یہ بھی عورت کے ہی ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے اطراف ایک حد قائم کر لے جسے پار کرنے کی جرت کوئی دوسرا نہ کر سکے۔ اور یہ بھی ممکن ہے جب وہ خود اپنی عزت کرنا جانتی ہو۔ پھر شوہر، بچوں کا غصہ اس پر نہیں اتارے گا، بھائی بات بات پر اس کی سرزنش نہیں کرے گا، باپ بیٹے کی نسبت ہر حکم کی تعمیل اس سے نہیں چاہے گا اور بیٹا اسے ہمہ وقت ملازمہ نہیں سمجھے گا

نہ ہی سسرالیوں کو اس پر ترجیح دے گا۔ مگر جذبات سے بنی اس مخلوق نے عام طور پر ہتھیار ڈال دینا سیکھا ہے اور یہ ہی اس کی کمزوری ہے لیکن جب جب عورت نے اپنا احترام خود کیا ہے، دنیا اس کے احترام کے لئے سرِ تسلیم خم نظر آئی ہے۔

بات صبر کی حد کی ہو رہی تھی مگر میں خود یہ سوچتی ہوں کہ کیا ممتا کی بھی کوئی حد ہوتی ہے؟ کچھ بھی ہو اور کچھ بھی کیوں نہ ہو، کیا خوف، ضرورت اور سماجی دباؤ کے پیشِ نظر ممتا ہتھیار ڈال سکتی ہے؟

اگر نہیں تو پھر ایبی کا قتل کیسے ہوا؟ اس روز وہ صحن میں کھڑا اماں سے پیسے مانگتا رہا تھا اور پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی ایلن پیکیز لوہے کے سریوں والی اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آئی اور ایبی کے جھونپڑے کے پاس پڑی ایک چھوٹی سی رسی میں پھندڈال کر اس نے ایبی کے گلے میں پرو دیا اور اس وقت تک رسی کے دوسرے سرے کو کھینچتی رہی جب تک کہ ایبی پیکیز کی گردن کی جلد پر خراشیں نہیں پڑ گئیں۔ اب ایلین کا بچہ اس دنیا میں نہیں تھا۔ اس صورتِ حال پر لکھنا غالباً میرے لیے بھی اس بات کو تسلیم کرنے کی ناکام کوشش ہے کہ حادثے ہو سکتے ہیں اپنے تحفظ میں، اچانک مگر سوچ سمجھ کر کوئی ماں اپنی اولاد کی جان کیسے لے سکتی ہے، نہیں لے سکتی کہ اسے تو اس نے نو ماہ پیٹ میں رکھا اور سو سال جینے کی دعائیں دیں۔ اس کی موت تو خود اسے زندہ در گور کر دے گی، جیتے جی مار ڈالے گی۔ جس کا بچپن جس کی یادیں اس کے لیے تمام عمر جینے کا سہارا ہوتی ہیں اور جسے وہ کبھی اپنے تصور سے جدا نہیں کر سکتی، اس کی موت کیسے بھولے گی اور خود اس کی جان لینے کے عمل کی یاد اسے چین سے سانس لینے کیسے دے گی اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اپنے انٹرویو میں محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والی قاتل ماں نے یہ ہی کہا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے بیٹے کو نہیں بھول سکتی

اور اس کی یاد میں گھر کے دروازے تک چلی آتی ہے۔ اس جیسا لباس پہنے اس کے ہم عمر لڑکوں کو دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آتا ہے اور ایسا حال ہوتا ہے کہ وہ دیوانی ہوسکتی ہے۔ اسے زیتون کے تیل کی وہ خوشبو چین نہیں لینے دیتی جس سے وہ ننھے ابی کے چھوٹے سے بدن پر مالش کر کے اسے سلایا کرتی تھی۔ اسے وہ لوریاں تِل تِل مارتی ہیں جو وہ اس کے لئے گایا کرتی تھی کہ یہ سب بھولنا اس کے جیتے جی ناممکن ہے۔ مگر وہ یہ بھی کہتی ہے کہ اب وہ کچھ دیر آرام کی نیند سو سکتی ہے کہ اب اسے ابی کے گھر میں گھس کر چوری کرنے کا خوف نہیں ہے۔ بلکہ اب اس کا شوہر بھی پہلے کہ نسبت پر سکون نظر آتا ہے۔ وہ کہتی ہے اسے بیٹے کی قاتلہ کہلوانا برا نہیں لگتا کہ یہ بات دوسروں کو نشے سے پیدا شدہ تباہیوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرے گی اور وہ لوگوں کی مدد سے ایک ری ہیبلی ٹیشن سینٹر کھولنے کا ارادہ رکھتی ہے کہ آگے کی نسل کسی طرح بچ سکے۔

یہ سب اپنی جگہ، مگر میرا ذہن پھر بھی اس بات کو قبول نہیں کر پا رہا کہ کسی ماں نے ہوش و حواس میں دانستہ طور پر اپنی اولاد کی جان لے لی۔ شاید اس لیے کہ مہذب معاشرے میں ان چیزوں کا تصور نہیں کیا جاسکتا جو جرائم کی محرک ہوا کرتی ہیں۔ بیٹے کی طرف سے روز بروز کا ذہنی تشدد اور پے در پے حملوں اور دھمکیوں سے ایلین کا دماغی توازن ضرور متاثر ہوا ہوگا۔ وہ خوف کے ایسے مسلسل دباؤ میں رہتی ہوگی کہ لاشعوری طور پر اس سے فرار چاہتی ہوگی ایسے ہی ذہنی تناؤ کے زیرِ اثر اس سے یہ حادثہ ہوا ہوگا کہ وہ اس کے بعد مہینوں ششدر سی رہی تھی۔ وہ اس حادثے کے بعد اپنے روز کے معمول سے پیچھے نہیں ہٹی۔ اس نے حادثے کے بعد اس ضعیف خانے میں جہاں وہ کام کرتی تھی، ایک بزرگ عورت کے سامنے سارا حال بیان کیا جس نے اسے پولیس کو آگاہ کرنے کا مشورہ

دیا۔ اُس پر مقدمہ چلا سزا ہوئی۔ اب دو ایک برس بعد اس کے حواس مجتمع ہونے لگے ہیں اور وہ گزشتہ حالات پر بات کرنے کے قابل ہوئی ہے۔ سمجھنے لگی ہے کہ کیا ہوا اور اب ایک اور درد سے مجروح ہوگئی ہے کہ اولاد کی موت کا غم تو پتھر کا سینہ بھی شق کر دے اور پھر وہ موت جو اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کے لئے منتخب کی ہو، اسے چین کی نیند کہاں سونے دی سکتی ہوگی۔ میڈیا اسے اکیلا نہیں چھوڑتی۔ مائیں اسے طعنے دیتی ہیں۔ اس کا جگر لخت لخت ہو چکا ہوگا۔ دل سے خون رستا رہتا ہوگا۔ بیٹے کے گلے میں کھنچ آئی خونیں لکیریں اسے اپنے ہاتھوں میں نظر آتی ہوں گی اور اسے کبھی چین سے جینے نہیں دیں گی۔ تو کیا منشیات کے شکار دنیا کے لیے اس قدر بڑی مصیبتیں ہو کر رہ جاتے ہیں کہ مائیں ہاتھوں سے اپنی کوکھیں اجاڑنے پر آمادہ ہو کر اپنے لئے زندہ در گور رہنا منتخب کر لیتی ہیں اور پھر نیم مردہ جیتی ہیں۔

سنا ہے میری وادی کے دشمنوں نے وادی میں نشے کا چلن عام کرنے کی ٹھان لی ہے، مائیں کہاں جائیں گی؟ اس خیال سے دل لہو رویا چاہتا ہے۔

☆☆

خوش پوش شب خونئے اور بے ضرر بستیاں

عالمی منظر نامے پر جو مسلمانوں کی صورت حال اور اسلام کے تیئں میڈیا کا رویہ ہے وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ اور اب رفتہ رفتہ بہت سے شکستہ دل اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کا ظاہری حلیہ بعض اوقات انہیں کئی کئی آزمائشوں میں ڈال دیتا ہے۔ اور یہ کہ اِدھر انہوں نے اپنا نام بیان کیا، اُدھر سننے والے کے چہرے پر نفرت کے آثار پیدا ہوئے۔ اور تاثرات بدلنے کے ساتھ برتاؤ بھی تبدیل ہوا اور اکثر منہ پھیرنے سے شروع ہو کر ستم ڈھانے پر ختم ہوتا نظر آیا۔ تعجب تو مجھے اپنے اس ملک کی سرزمین پر ہو رہے ان عجیب وغریب واقعات پر ہوتا ہے جو نظر آ کر بھی واضح نہیں ہو پاتے، جو بیان ہو کر بھی پوشیدہ ہی رہتے ہیں، جن کی متحرک تصاویر ثبوت سمیت دنیا کے سامنے لائی جاتی ہیں اور جن کی تفصیلات اخباروں اور رسالوں کے صفحے سیاہ کرتی ہیں مگر وہ اگلے دن تک بدلی ہوئی اشکال میں نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ کون سا کالا جادو ہے جو ہر سچ کو آناً فاناً میں جھوٹ کر دیتا ہے۔ یہ کون سی طاقتیں ہیں جو ہر مجبور کو ملزم بنانے کی کوشش میں ناکام ہونے کے باوجود ہمت نہیں ہارتیں۔ بہانے بہانے سے ظاہر ہونے والی یہ منظم سازشیں کیا محض اتفاق ہیں۔

عام امن پسند انسانوں نے تو بٹوارہ نہیں کیا تھا۔ سیاستدانوں کی ناعاقبت اندیشی اور انا کے جھگڑوں کے سبب یا کسی اور طاقت کے زیرِ اثر ملک کے ٹکڑے ہوئے ہوں گے، اس میں یہاں کی اقلیتوں کا کیا قصور۔ عجیب عجیب بہانوں سے کسی فرد کو جو اپنے گھر، شہر اور ملک سے محبت کرتا ہے، کب تک غیریت کا زہر پلا پلا کر ہلاک کیا جائے گا۔ اسے رسوا کرنے کے لئے الزام تراشیاں کی جاتی رہیں گی۔ اسے لوٹا کھسوٹا، تباہ و برباد کیا جائے گا اور پھر الزام بھی اسی پر دھرا جائے گا۔ اپنی سیاسی عاقبت سنوارنے کے لئے انہی کی بستیوں میں دھماکے کیے جائیں گے اور انہیں ہی زندانوں کے حوالے کیا جائے گا۔ کسی سادہ سی سماجی تنظیم کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہوتی تو ایک کورٹ پابندی ہٹانے کی اگر سفارش کرے تو دوسری عدالت اسے stay کر دیتی ہے۔ جبکہ بربریت کا کھلے بندوں مظاہرہ کرنے کے بعد کسی کے خلاف کوئی ایسی سزا سننے میں نہیں آتی، جس سے دوسرے عبرت حاصل کرتے ہوں۔ ہزاروں لوگ چند افراد کو برباد کرنے آن پہنچتے ہیں اور خاصی تعداد میں بعض پولیس والے خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اور کہیں پر فوج کی بڑی تعداد بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ بلکہ دونوں اپنا اپنا حصہ طلب کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ لوگ ہاتھوں میں نوکیلے ہتھیار لے کر سرِ عام توڑ پھوڑ کرتے حملے پر تیار اخباروں میں نظر آتے ہیں، ٹیلی ویژن پر دکھائی دیتے ہیں اور ان کو کوئی گناہ گار نہیں کہتا۔ اور عالم یہ ہے کہ دوسری ریاستوں سے باقاعدہ غنڈوں کی پلٹنیں منگوائی جاتی ہیں جو ریل کی پٹریاں اکھاڑنے، گاڑیاں توڑنے اور ہڈی پسلی ایک کرنے میں کچھ ایسی مہارت رکھتے ہے کہ کیمرے کی حساس آنکھ تک ان کے چہروں پر کوئی تاثر تلاش نہیں کر پاتی۔ گویا یہ ان کا روز کا ہی کام ہے۔ اور یہ بات سچ بھی ہے۔

ہمارے ملک میں کچھ سیاسی سرمایہ دار روز بروز مزید دولت مند ہو کر عام انسان کے منہ کا نوالا اسی سوچی سمجھی سازش کے تحت، اسی خاص مقصد کے لیے چھینتے ہیں کہ بعد میں یہ قلاش اور غیر تہذیب یافتہ قبیلے چند روپیوں کے عوض لوگوں کی جان لیں، مال لوٹیں، عزت سے کھلواڑ کریں۔ ایک ایسی ہی غیر قانونی، بے وردی فوج اب ان مفاد پسندوں نے اپنی گناہ گارانہ منزل کے حصول کے لیے جگہ جگہ تیار کر رکھی ہے۔ اگر یہ سیاسی سرمایہ دار، بے ایمانی چور بازاری اور لوٹ مار کا حصہ نہ ہونگے تو کیوں کوئی کچھ پیسوں کے لالچ میں لوگوں کی جان لینے کی خاطر ماتھے پر لکیر کھینچے، ہاتھوں میں تین تین منہ والے نیزے اُٹھائے نکل کھڑا ہوگا۔ اگر اُن کو جاہل نہ رکھا گیا تو کون اِن کے یہ ناجائز کام انجام دے گا۔ یہی تو ہیں وہ وحشی جو وقتاً فوقتاً چند سِکّوں کے عوض بے تاثر چہرے لیے کشت وخون پر تیار ملتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے تحفظ کا بھی یقین ہوتا ہے۔ کہ یا تو انہیں معلوم ہے کہ میڈیا کے ذریعہ کلوز اپ میں نظر آنے کے باوجود انہیں کوئی پہچان نہیں پائے گا۔ تلاش نہیں کر پائے گا۔ اور یا انہیں اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی ہوتی ہے کہ ان کا کسی بھی حالت میں کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکے گا۔

ہم ایسی سیاست کے مُہرے ہیں جس کی بساط ہی غلط بچھی ہے۔ مگر مُہروں کی تو کوئی خطا نہیں ہوتی۔ یہ کرسیوں کی جنگ لڑنے والے ایک دوسرے پر الزام دھرتے ایک مخصوص فرقے پر ستم توڑتے رہتے ہیں اور وہ بھی کبھی ایک نام سے تو کبھی دوسرے نام سے اور اصل میں کرسیوں کے یہ دونوں طلب گار ایک ہیں اور اِدھر اُدھر ہوتے نظر آتے ہیں۔ ایک جیسی سوچ کے حامل ہیں۔ ایک جیسے اعمال رکھتے ہیں۔ بس نشانیاں الگ الگ لہراتے ہیں کہ الگ سے نظر آئیں اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہیں۔ اور ان کی اصلی ملی بھگت

ایسی ہے کہ آپس میں بھلے ہی لڑتے معلوم ہوں مگر جب مظلوموں پر مزید ستم توڑنے گا معاملہ ہوتا ہے تو اس وقت ان کی افسر شاہی، ان کا عدلیہ اور ان کا انتظامیہ خود کار مشینوں کی طرح اپنے آپ، ان ہی بے قصوروں کے خلاف منظّم طریقے سے کارفرما ہو جاتا ہے جو نادان بار بار ان پر اعتبار کیے چلے جاتے ہیں۔ حالیہ واقعات نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ تعصب کا زہر اکثریت کے ایک بڑے حصے میں موجود ہے گو کہ کچھ منصف مزاج بھی ہمارے یہاں پائے جاتے ہیں مگر ان کی سننے میں خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اب ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ صرف اتنا کہ اس مقہور طبقے کے رہنما اور رہبر بھی کچھ اس طرح متحد ہو جائیں کہ مل کر پوری قوم کے مفاد کے لئے ہی سوچیں، نہ کہ فرداً فرداً اپنے سیاسی یا سماجی یا مالی فائدے کے لیے۔ اور ہرگز ہرگز کوئی غیر دانشمندانہ قدم نہ اٹھایا جائے جس سے اس طرح کی طاقتوں کو زور آزمائی کا بہانہ میسر ہو کہ پھر کوئی دوسرا راستہ نہیں بچتا اور اپنی بساط بھر کوشش تو کرنا ہی ہوتی ہے۔ سیکولرازم کی موجودگی کا کوئی ایسا جواز اب نظر نہیں آتا (پہلے بھی نہیں آتا تھا مگر ایک امید سی لگی رہتی تھی۔) کیونکہ اکثر جنہیں سیکولر سمجھا گیا وہ اصل میں اس انداز سے صرف اپنی تشہیر چاہتے تھے مگر ابھی چند سیکولر اذہان موجود ہیں جن کی تعداد میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ ضرورت اپنے اندر بھی دور اندیشی پیدا کرنے کی ہے کہ اگر ایک شخص کی بات کا یقین کرنے والے لاکھوں افراد ہوں تو اس ایک شخص پر ہی ان لاکھوں افراد کے اعتماد کو ٹھیس سے بچانے کی ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔ لمحوں کی خطا تو دانا کہتے ہیں کہ صدیوں نے بھگتی ہیں۔ ہر قائد یہ چاہے گا کہ تاریخ اس کا نام فخر سے دہرائے۔ اس پر کسی تہذیب کے خون کا الزام نہ آئے۔ وہ ظالم کی حمایت کا ذمہ دار نہ گردانا جائے کہ قدرت کا انصاف یہاں بھی ہوگا اور وہاں بھی۔

میری سمجھ میں ایک اور بات بھی نہیں آتی کہ میری اس وادی میں، تاریخ شاہد ہے کہ صدیوں فرقے وارانہ فسادات نہیں ہوئے۔ کسی ایک فرقے کے کسی فرد نے اگر دوسروں کو پریشان کرنے کی کوشش کی تو سب نے یکجا ہو کر ایسی حرکت کی مذمت کی۔ کچھ صدی پہلے ہماری وادیٔ کشمیر کی ایک برادری کے کچھ افراد نے ہجرت کی تھی تو خود سلطان زین العابدین بڈشاہ نے انہیں بلوا کر اونچے عہدوں پر فائز کیا۔ کچھ لوگ دہائی ڈیڑھ دہائی پہلے گئے تو لوٹ آنے والوں کو یہاں کے باشندوں نے پلکوں پر بٹھایا۔ خوشی منائی اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ تو پھر یہ کون سا بغض ہے جو ان کے اندر پنپتا رہا اور اب زہر بن کر نکل رہا ہے۔ یہ کون سا عناد ہے جسے یہ لوگ چپکے چپکے نفرتوں سے سینچتے رہے اور اب بلا کسی سبب کے منظر عام پر لا رہے ہیں۔ یہ کون سا حسد ہے جس کی آبیاری برسہا برس تک کی جاتی رہی اور اب موقع پاتے ہی اس کا شکار معصوم لوگ ہو رہے ہیں۔ ان کو تو اس معاملے سے کچھ لینا دینا ہی نہیں تھا۔ پہاڑوں پر رہنے والی اس بے ضرر مخلوق نے ان کا کیا بگاڑا تھا جو ان کی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں جا جا کر ان کے مسکن برباد کیے گئے۔ جنگل کے دامن میں ناپختہ گھروں اور مٹی کی کوٹھریوں کے باسی، مویشی پال کر گذر بسر کرنے والے ان معصوم لوگوں کو تو کسی تشدد سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ وہ تو اپنی مٹھی بھر زمین، چراگاہوں اور چرند و پرند سے سروکار رکھنے والے سادہ سے لوگ ہیں۔ ان کے کچے گھروں کو نظر آتش کر کے، انہیں مار پیٹ کر، لوٹ پاٹ کر بھلا اس برادری کو کیا حاصل ہوا سوائے ایک جنونی تجسس کی تسکین کے۔ ان گاڑی بانوں نے ان کا کیا بگاڑا تھا جو روز گار کی خاطر مجبور ہو کر گھر سے نکلے تھے کہ انہیں روک کر لہولہان کیا گیا اور ان کی گاڑیوں کو شعلوں کی نذر کر دیا گیا۔ ہم وطن اگر کسی دور کی سرزمین پر مل جائیں، تو

انسان کو دلی مسرت حاصل ہوتی ہے۔اس برادری کے شر پسند تو یہ ثابت کرنے پر تُلے نظر آتے ہیں کہ ان کے اندر انسانیت کی کوئی رمق نہیں پائی جاتی۔گاہے گاہے سننے میں آتا تھا کہ ان میں اکثر لوگ متعصّبانہ فطرت رکھتے ہیں مگر خلوص سے بنا اس وادی کا سیدھا سادہ پرخلوص ذہن اس پر یقین ہی نہیں کرتا تھا۔معصوموں پر شب خون مار کر انہوں نے صرف اپنی طبیعت کے اس شدید مجرمانہ پہلو کو بے نقاب کیا ہے جواب تک در پردہ تھا۔پیروں فقیروں اور رشیوں منیوں کی اس سرزمین پر پلنے والی اس برادری سے وابستہ ان افراد کی طوطا چشمی ہم جیسے انسانوں کو حیرت میں ڈالے دیتی ہے کہ اس مٹی کے باسی ہونے کے ناطے باہر والوں کی نسبت یہ بہتر طور پر جانتے تھے یہاں کی اکثریت نے کہ ان کی ہر عبادت گاہ کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔ان کے تہواروں میں ساتھ دے کر ان کی خوشیاں دوبالا کی ہیں۔ان سے محبت کی ہے۔ان کی عزت کی ہے۔ان کی محنت پر اعتماد کر کے انہیں بڑے بڑے عہدوں سے نوزا ہے۔پھر بھلے ہی اس کا سبب اس برادری کے آپسی بھائی چارے کے تحت حمایت ہی کیوں نہ رہا ہو کہ اسی کے زیر اثر انہوں نے اکثر اپنی ہی نسلوں کو سینچنے میں یقین رکھا۔اور اپنی نسلوں کو سینچنا بُرا نہیں ،بشرطیکہ دوسروں کی حق تلفی نہ ہو۔یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ ایسے بعض افراد کے کچھ عرصہ غیر حاضر رہنے سے یہاں کی اکثریت کی بے کراں خوبیاں بھی منظر عام پر آ گئیں جو ہر شعبے میں کرۂ ارض کی کسی بھی قابل قوم کے ساتھ کامیاب مقابلے کے لئے ایستادہ ہو سکتی ہے۔ان کی دوبارہ آمد کو وادی کے ہر فرد نے خوش آمدید کہا اور اس خلوص کے صلے میں ان کی شخصیت کے یہ ناگوار پہلو سامنے آنے لگے۔ان کے دوراندیش بزرگ بھی ان ناعاقبت اندیشوں سے نالاں ہوں گے کہ اُنہوں نے اس طرح کے کاموں سے ہمیشہ گریز کیا تھا اور یہ

ان کی ،حکمت اور کشمیری ذہن کی محبت پسند طبیعت سے واقفیت تھی کہ صدیوں ساتھ رہنے کے باوجود ہمیشہ محبتیں اور شفقتیں بانٹی جاتی رہیں۔ خلوص اور اعتماد ہی تقسیم ہوا۔اور شاید اب بھی اس بات کے خواہاں ان کے یہاں بھی بے شک موجود ہوں گے کہ سب جانتے ہیں جھگڑے پیدا کرنا پل بھر کا کام ہیں اور ہمدردی اور ایثار اعتبار پر مبنی ہوا کرتا ہے۔

'کہ ہر اک کارنامہ ان سے ہی منسوب ہوتا ہے'

انگریزی حکومت سے آزادی نے جہاں تقسیمِ ملک کی صورت میں رنج و الم کی دود و کہانیاں رقم کیں وہیں تاریخ کے کئی صفحے انسانی خون کے بے مول ہو جانے کے دردانگیز واقعات سے بھی پُر کر دیے اور ایسے کتنے ہی مسائل سرحد کی دونوں طرف آن کھڑے ہوئے جن کا کوئی حل نکلتا نظر نہیں آتا۔ ہمارے یہاں اب ایک زمانے سے آزادی کی جدو جہد کو ملک کی اکثریت سے جوڑا جاتا ہے۔ ان مجاہدینِ آزادی کا ذکر بھی سننے میں نہیں آتا جو مسلمان تھے۔ کیا اس تہذیب یافتہ دور میں بھی انسان اتنا کوتاہ نظر اور تنگ دل ہو سکتا ہے کہ ایک مقصد کے لئے شانہ بہ شانہ لڑنے والے ایک فریق کو بھلا ہی دیا جائے تاکہ کامیابی کا سہرا دوسرے کے سر جائے، آزادی کے شہیدوں کو غیر کہہ کر نفرتیں پیدا کی جائیں اور ان نفرتوں کو منصوبہ بند طریقے سے بڑھاوا بھی دیا جائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، خان عبدلغفار خان، مولانا محمد علی جوہر، رفیع احمد قدوائی، فخرالدین علی احمد، عباس طیب جی، شہیدِ اشفاق اللہ، آصف علی اور ایسے کئی نام ہیں جنہوں نے گاندھی جی کے ساتھ کام کیا تھا۔ بے شمار اہم ناموں کو نصابی کتب میں اہمیت نہیں دی گئی۔ یہ لڑائی تو ہر ہندوستانی کی تھی۔ آزادی کے متوالوں نے مل جل کر معرکے سر کیے

تھے۔ مثال کے طور پر شہیدِ اشفاق اللہ جنہوں نے اپنے دوست پنڈت رام پرساد بسمل کے شانہ بشانہ کارنامے انجام دیے۔ دونوں اردو میں شاعری کرتے تھے رام پرساد، بسمل تخلص کرتے تھے اور اشفاق اللہ، حسرت کے قلمی نام سے شعر کہتے تھے۔ ان دونوں کے کارناموں میں کاکوری ڈاکے کا مشہور واقعہ بھی تھا جہاں انہوں نے انگریزی سرکار کا پیسہ جو تین سو (۳۰۰) برس سے وہ ہندوستان کو لوٹ کر حاصل کرتے تھے ریل کے ڈبے سے نکال کر انہیں کے خلاف جنگِ آزادی کے لیے استعمال کیا اور اس کی پاداش میں دونوں دوستوں کو سزا ہوئی۔ دونوں کو ایک ہی وقت تختۂ دار پر چڑھایا گیا مگر جدا جدا جیلوں میں۔ انگریز کے خلاف آزادی کی پہلی لڑائی لڑنے والے میسور کے شیر ٹیپو سلطان کا بھی ذکر کہیں نہیں ہوتا۔ یہ تازہ خیال اس وقت آیا جب کچھ روز قبل ٹیپو سلطان کی دوسو چودھویں برسی پر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے سینٹر فار سٹریٹجک اسٹڈیز کو میسور کے اس عظیم حکمراں کے نام کرنے کا اعلان کیا۔ وہ ایک جنگجو سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور دانشور بھی تھا۔ اس کے دربار میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی اور اس نے دوسرے مذاہب کی عبادت گاہیں بھی تعمیر کروائیں۔ دوسری میسور جنگ کا معاہدہ ایک ایسا واحد معاہدہ ہے جو انگریزوں سے کسی ہندوستانی حکمران نے اپنی شرائط پر منوایا۔ اس معاہدے کو بھارت کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ نپولین بوناپارٹ نے مصر پر اس لیے حملہ کیا تھا تا کہ وہ ہندوستان کے تعاون سے انگریز کے خلاف لڑے۔ وہ وسط ایشیا میں اپنی کولونی چاہتا تھا۔ اس نے ایک موقع پر کہا تھا کہ 'مصر فتح کرتے ہی وہ پندرہ ہزار کی فوج ہندوستان بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے تا کہ وہ ٹیپو صاحب کی فوجوں سے مل کر انگریز کو نکال باہر کرے مگر نپولین کا یہ خواب پورا نہ ہوسکا اور ٹیپو سلطان بھی چوتھی میسور جنگ ہار

گیا۔ حالانکہ اس زمانے میں بھی انگریز کی بندوق استعمال کرنے والی فوج کی نسبت ٹیپو سلطان کی فوج میزائل اور راکٹ تک داغنا جانتی تھی مگر تعداد میں کم، یعنی صرف تیس ہزار تھی اور انگریز کو مراٹھوں اور دوسری ریاستوں کے تعاون سے پچاس ہزار سے زیادہ افواج میسر تھیں۔ سپاہیوں کے ساتھ لڑتا ہوا ٹیپو سلطان بے مثال بہادری سے لڑا اور اپنی راجدھانی بچاتے ہوئے شہید ہوا۔ اگلے روز دوپہر کو اس کا جسد خاکی اس کے والد کے مزار کے برابر سپرد خاک کیا گیا۔ کہتے ہیں اس وقت ایسا زبردست طوفان آیا کہ اہلِ ہند نے اور نہ ہی فرنگیوں نے پہلے کبھی دیکھا تھا۔ آسمان دہاڑا تھا اور دھرتی ہل گئی تھی، غالباً اپنے اس بہادر اور شجاع سپوت کو اپنی مستقل پناہوں میں لینے کے لیے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انگریزی سیاست صدیوں سے مسلم قوم کو نیست و نابود کرنے کے درپے رہی ہے۔ ہند میں بھی انگریزی حکومت کا یہ ہی موقف تھا۔ انگریزی سرکار خصوصی طور پر مسلم دانشوروں سے خائف رہتی تھی اور معمولی سے بہانے پر انہیں پھانسی پر چڑھا دیا جاتا یا کالے پانی کی سزا ہوتی۔ مولوی سید علاالدین کالے پانی کو بھیجے جانے والے پہلے ہندوستانی تھے۔ لیکن مورّخ اگر منصف مزاج نہ ہو اور مختلف قسم کے تعصّبات کے ساتھ جی رہا ہو تو عظمت و شجاعت کی کئی کہانیاں ماضی کے اندھیروں میں کبھی نظر نہ آنے کے لیے کھو جاتی ہیں۔

ایک اور کارنامہ مولوی سید علاؤالدین کا ہے جن کا جنم تلنگانہ خطے کے نالگنڈہ میں ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے دوست اور مجاہدِ آزادی طُرّہ باز خان اور تین دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ مسجد میں ریزیڈنسی پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ (اس عمارت میں آجکل خواتین کا کالج ہے۔) کہتے ہیں وہاں انگریز نے پانچ سو (۵۰۰) ہندوستانی مجاہدین کو قید کر رکھا تھا اور انہیں ہر طرح کی اذیتیں دی جاتی

تھیں۔ ریذیڈینسی پر حملے کی قرارداد پر تین سو (۳۰۰) مجاہدینِ آزادی نے دستخط
کیے اور اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مولوی سید علاؤالدین اپنے
روہیلا کمانڈر طُرّہ باز خان کے ساتھ صفِ اول میں تھے۔ بندوقوں سے لڑائی
لڑی گئی اور مولوی صاحب قید کر لیے گئے اور انیڈیمان نیکوبار کے خوفناک اور
پُرخطر جزائر میں رہنا ان کا مقدر ہو گیا جہاں اطراف میں دلدل ہی دلدل تھا اور
زہریلے کیڑے چہل قدمی کرتے نظر آتے تھے۔ بعد کو انہی مجاہدین نے ان
جزائر کو جان کی قربانیاں دے کر جستہ جستہ قابلِ رہائش بنایا تھا۔ مولوی صاحب کو
دوبارہ وطن آنا نصیب نہ ہوا اور انہوں نے پورٹ بلیئر کی سیلولر جیل میں زندگی کی
آخری سانس لی۔ پورٹ بلیئر کی سیلولر جیل جواب میوزیم میں تبدیل کی گئی ہے،
وہاں ہر شام روشنی اور آواز کا 'شو' ہوا کرتا ہے جس میں جنگِ آزادی کے عظیم
سپوتوں کی کہانی دہرائی جاتی ہے۔ مولوی سید علاؤلدین کے علاوہ کئی اور اہم نام
بھی ہیں مگر کسی مسلمان جانباز کا کچھ ایسا ذکر نہیں کیا جاتا جس کی شجاعت کی
داستانوں سے ہندوستان کی آزادی کی کہانی مکمل ہوتی ہے۔ ممکن ہے ایسا قصداً
نہ ہو مگر یہ لغزش آنے والی نسلوں کو اپنی قوم کی عظمت سے بے بہرہ رکھے گی اور یہ
بات ان کی خود اعتمادی کو عرصۂ دراز تک زخمی کرنے کے ساتھ ساتھ عدم تحفظ کا
شکار کرے گی۔ نصابی کتابوں میں بھی تاریخ کو غلط انداز سے رقم کر کے مسلمانوں
کی قربانیوں کو نہ صرف نظر انداز کیا جارہا ہے بلکہ منفی انداز میں لکھا بھی جارہا ہے۔

غلط جو بھی ہو اس کی ذمہ داری ہم پہ عائد ہے
کہ ہر اک کارنامہ ان سے ہی منسوب ہوتا ہے

(ت ر)

انگریز سکھا گیا تھا کہ باہم لڑاؤ اور راج کرو مگر یہ منطق خود اس کے کام

بھی زیادہ دیر نہ آئی تھی۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں انگریز کے آنے سے پیشتر کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوتے تھے، دلوں کی یہ دوریاں انہوں نے ہی پیدا کی تھیں کہ اکثریت والے فرقے میں ایسے اذہان بھی ہیں جو نفرتوں کو بڑھاوا دیتے ہیں اور ہٹلر اور مسولینی کو اپنا آئیڈیل کہتے ہیں مگر اسی فرقے میں مذہبی رواداری اور اخوت کے علم بردار بھی پائے جاتے ہیں جو ان کے جھوٹ کو بے نقاب کر کے سچائی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور اسی لیے اس ملک میں محبتوں کے وہ پائدار رشتے ہیں جن سے متاثر ہو کر دنیا کے دوسرے ممالک سے لوگ سکون اور مسرت کی خاطر یہاں کی سیاحت کے لیے آتے ہیں کیوں کہ کوئی جذبہ جذبۂ انسانیت سے جیت نہیں سکتا کہ انسان آخر اشرف المخلوق ہے اور ضمیر گاہے گاہے اس کے کیے کا حساب مانگتا ہے۔

'مر کے بھی چین نہ پایا'

ایک زمانہ وہ تھا کہ میری اس پاک سرزمین پر اگر کسی شخص کی کسی حادثے میں جان جاتی تھی تو ہر سننے والے کی آنکھ نم ہو جاتی تھی، دل سوگوار ہوتا تھا۔ برسوں میں شاذ و نادِر اگر کوئی کسی کی جان لے لیتا تو اور کئی برسوں تک اس حرکت کے تیئں غم و غُصّہ پھیلا رہتا۔ اور خود اپنی جان لینے جیسے واقعات تو سننے میں ہی نہ آیا کرتے۔

ایک زمانہ یہ ہے کہ حادثوں میں جان چلی جانے کی خبروں پر کوئی چونکتا ہی نہیں۔ غصے کی عمل کے ساتھ لوگ انتقام جوڑ دیتے ہیں اور دوسرے کی زندگی کی قیمت صفر ہو جاتی ہے۔ اور غُصے میں اُنہیں خوفِ خُدا رہتا ہے نہ ضمیر کوئی صدا بلند ہوتی ہے۔ ان سب تبدیلیوں کے اسباب پر شاستر لکھے جاتے ہیں کہ دنیا بڑے ظالم انداز میں بدل رہی ہے۔ دولت اور طاقت کی مِلی بھگت، خود پرستی اور انسان دشمنی کا چلن، طمع طینتوں کے ہاتھوں معصومیتوں اور سادگیوں کا استحصال اور اس کے شکار لوگوں میں خود آ گہی اور علم کا فقدان۔ بلکہ اس سب کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہات ہیں جن کا سبب عام انسان کی سمجھ سے خاصا بالاتر ہوا کرتا ہے۔

یہ وہ سب معاملات نہیں جو ظالم کے ہاتھوں مظلوم پر آزمائے جاتے ہیں، مگر ان سے کہیں تکلیف دہ اور تشویش ناک خود اپنی جان لینے کا عام ہو رہا

رجحان ہے۔جس کے کئی اسباب ہو گئے ہیں اور جن پر پھر ایک گرنتھ لکھا جا سکتا ہے کہ عالم بھر کے لوگ اچانک کنفیوز ہوا ُٹھے بنی نوع انسان کے اندر عجب طرح کی بوکھلاہٹ کا پیدا ہونا ضروری ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس کے شکار فرد کا خود اپنا بھی کوئی قصور ہے؟ جیسا کہ بعض ماہرین نفسیات کے مطابق یا قانون کی رُو سے سمجھا جا سکتا ہے۔

مگر میرا یقین ہے کہ اپنی جان لینے والے انسان پر اس کے اس عمل کی قطعی کوئی ذمہ داری عائد نہیں کی جانی چاہیے۔دنیا تو ازل سے ظالم اور زمانہ صدیوں سے سنگدل کہلاتا رہا ہے،بات اس ماحول کی ہے جسے عرف عام میں گھریلو فضا کہا جاتا ہے۔جس خوش نصیب کو گھر کی چار دیواروں کا تحفظ اور شریکِ حیات یا والدین اور ہم شیروں کا ساتھ دستیاب ہواُسے کیا چیز یہ آخری قدم اُٹھانے پر اُکسا سکتی ہے۔ظاہر ہے کہ گھر کے اندر کی ہی کوئی کمی اس کا سبب ہو جاتی ہوگی۔ہار اور مایوسی میں اپنے عزیزوں کا ساتھ،اپنے رفیقوں کے دو ہمت بھرے بول،اپنے شفیقوں کی مٹھی بھر شفقتیں کیا اب عنقا ہو گئی ہیں۔کیا ہر انسان اپنی دنیا میں اس قدر مُنہمک ہے کہ ساتھ رہنے والے انسان کی ذہنی حالت کا کسی کو علم ہی نہیں ہوتا،یہاں تک کہ وہ ختم ہو جاتا ہے۔کیا والدین محبتیں نچھاور کرنے کے لیے اپنی شرائط باندھ لیتے ہیں کہ اولاد ان کی تکمیل میں ناکامی کے خوف سے اپنی جان لے لیتی ہے۔مان لیا کہ باہر کی دنیا میں ایسی بھاگم بھاگ مچی ہے کہ ایک طوفان کا گماں ہوتا ہے۔مگر کیا گھروں کے دروازے اتنے مضبوط نہیں ہیں کہ یہ طوفانی لہریں اندر آ کر گھر ہستی کے سُکھ میں مخل نہ ہوا کریں اور گھر کے ہر فرد کی نظر میں گھر کا تصور ایک تقدس سے جڑا رہے۔جس میں باہر کی دنیا کے مصنوعی سُکھ کی پرواہ ہی نہ کی جائے۔ایسی کسی دوڑ میں شامل ہونے کی خواہش کو

سیراب ہی نہ کیا جائے جس میں قرضہ جات لے لے کہ ایسی چیزیں خریدنا شامل ہوں جن کی انسان کو سرے سے ضرورت ہی نہیں ہوتی، اور جو وہ محض دوسروں کی دیکھا دیکھی خریدنے پر مائل ہو جاتا ہے۔ صارفیت اسی کو تو کہتے ہیں کہ اپنے مال کی تشہیر کرا کرا کے اسے دوسروں کے ذہنوں پر کچھ ایسے مسلط کیا جائے کہ خریدتے ہی بنے۔

ہم کیوں اس بے منزل کی دوڑ میں شامل ہو کر قدرت کے عطا کردہ سُکھ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر تُل جاتے ہیں۔

ہماری وادی کی نوجوان نسل اتنی مایوس کیوں ہو کہ اپنی ہی جان کے درپے ہو جائے۔ انسان کے اندر اتنی خود اعتمادی کیوں نہ ہو کہ اپنی زندگی سے مطمئن رہنا سیکھ لے۔ منزل کی طرف گامزن ہونا ایک نیک فال ہے۔ مگر منزل نہ پانے کے تصور سے اس قدر خوف زدہ ہو جانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ہر معاملے کے دو رُخ ہوا کرتے ہیں، بلکہ دو سے زیادہ بھی۔ یعنی کئی کئی زاویوں سے ہم زندگی کے ہر پہلو کو دیکھ سکتے ہیں۔ کوئی سوچ، کوئی محرومی، کوئی ناکامی اتنی بڑی نہیں ہوتی کہ ایک بار عطا کی گئی اس زندگی کو ہم داؤ پر لگا دیں۔

سوال یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو بڑا پُرسکون اور ہشاش بشاش بنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے کہ ہر بچہ کسی سبب سے اگر تھوڑا بہت روتا ہے تو بلا کسی سبب کے بکثرت مسکراتا بھی ہے کیونکہ فطرتِ انسانی امن پسند ہے۔ سکون اس کے اندر رہا کرتا ہے۔ اپنی روح کے اندر رہنے والے سکون کو ہم باہر کی کسی شئے کے زیرِ اثر برباد کیوں ہونے دیں۔ ہم باہر کی کسی چیز کو اپنے اندر کا سکون غارت کرنے کی اجازت کیوں دیں؟

انسان مشکلوں کو ہرانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ مشکلوں سے ہارنا تو بڑا

آسان کام ہے۔ ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھ جایئے گا تو مایوسی کی جادوگرنی آپ پر جان لیوا سحر کرنے لگے گی۔ پھر کیا کیجیے گا۔؟ جان دے دیجیے گا۔؟

ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوا کرتا ہے۔ مگر ذہن اگر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر مایوسی کے شاٹ کٹ کو حاوی کر دے تو کوئی راستہ نظر نہیں آئے گا۔

یہ بھی ایک صداقت ہے کہ ایک عجیب سی کنفیوزڈ قسم کی مایوسی آج کی جوان ہو رہی نسل کو رہ رہ کر اپنی لپیٹ میں لینے لگتی ہے۔ اور کبھی کبھی انسان سے محبت کرنے والے لوگ بھی اسے سمجھا نہیں پاتے۔ ایسے میں پیشہ ور ماہر نفسیات کی خدمات بدرجہ اُتم کام آیا کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں جہالت کے سبب یہ خیال عام ہے کہ ماہر نفسیات کے پاس جانے کا مطلب پاگل پنے کا علاج کرنا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ Psychatrist کی مدد لینا انسان کی ذہنی صحت کے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا Physician کی مدد لینا ہے۔ بلکہ سرکار کو چاہیے کہ اس طرح کے ڈاکٹر کی خدمات عوام کے لئے عام کر دی جائیں کہ یہ عوام کے تئیں بہت بڑی خدمت ہوگی اور انسانیت کے لئے ایک عظیم انعام۔

جو قوم اپنے بچوں کی صحیح پرورش و پرداخت نہیں کرتی، اُس کی آئندہ کی نسل جرائم پیشہ ہو جاتی ہے اور جو اقوام اپنی جواں نسل کا تحفظ کرنے میں ناکام رہتی ہیں، آخر کار ختم ہو جاتی ہیں۔ ہماری نوجوان نسل آخر کس کس طرح کے عدم تحفظ کی شکار ہے جو مرد و عورت، نوعمر بچے اپنی قیمتی جانیں گنوانے پر تُل گئے ہیں۔ ثابت ہوا کہ ہم ایک ناکام سماج، ایک نااہل سرپرستی اور ایک غیر یقینی مستقبل کے زیرِ اثر سانس لے رہے ہیں۔ اپنی جواں نسل کے ناکام تحفظ کے سبب کُل عالم میں ہمیں شرمندہ ہونا پڑے گا۔ حالات نے کچھ کم ستم نہیں توڑے ہم پر، اب جو بچ رہا ہے، ہم اسے بھی محفوظ نہ رکھ پائے تو اپنے اللہ کو کیا مُنہ دکھائیں گے۔ جب

تک کسی معاشرے کا ہر فرد احساسِ ذمہ داری سے سماج میں اپنے حصے کا کام کرنے کے لئے آگے نہیں آئے گا، صورت حال بدلے گی نہیں۔ ہم سب کو اپنی بساط بھر کوششیں کرنا ہونگی کہ انسانی زندگیوں کا تحفظ ہی ہر انسان کا اولین فرض ہے۔

سب کچھ التوا میں ڈالا جا سکتا ہے مگر جان بچانا انسان کا اہم ترین فریضہ ہے، خواہ وہ اس کی اپنی جان ہو یا دوسرے کی۔ چپکے چپکے مر جانے والے یہ معصوم لوگ کب تک اپنی قیمتی جانیں لیتے رہیں گے۔

ہم آگے بڑھنے کی اندھی دوڑ میں اپنی وہ اخلاقیات ہی فراموش کر بیٹھے جو ہماری شناخت ہوا کرتی تھی۔ محلے یا کالونی کے لوگ اگر ہمدردانہ انداز میں ایک دوسرے کی خبر گیری کرتے رہیں تو ایسا موقعہ ہی کیوں آئے۔ بڑے شہروں کے مصنوعی ماحول کا جھوٹ ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔ ہمیں تو ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ کا شاہد رہنا ہے۔ اپنے اندر اس خلوص کے جذبے کو تازہ رکھنا ہے جو ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ہم اگر بڑے ہیں تو اپنے اطراف کے چھوٹوں کے مسئلوں کو حل کرنے میں معاون ہونا ہے اور اگر چھوٹے ہیں تو اپنے بڑوں پر اعتماد کرنا ہے، دُکھ سکھ بانٹنے ہیں کہ ان حالات کا شکار کبھی بھی، کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

اگلے وقتوں میں لوگ بڑے بوڑھوں کی صحبت میں وقت گزارا کرتے تھے۔ بزرگ اپنے تجربوں، حکایتوں اور روایتوں کے ذکر سے حاضرین کی ذہنی تربیت کیا کرتے تھے اور اس میں کسی کی کوئی شعوری کوشش نہیں ہوا کرتی تھی۔ بس ایک پیغام تھا جو اِدھر سے اُدھر سفر کرتا اپنا کام کیا کرتا تھا اور بے شمار چھوٹے چھوٹے مسائل بڑے مسئلے بن جانے سے پیشتر ہی حل ہو جایا کرتے تھے۔ اب میڈیا نے ان تمام روایات پر شب خوں مار دیا ہے۔ نہیں بدلی تو انسان کی فطرت۔ وہ ویسا ہی گوشت پوست کا جذباتی آدمی ہے جسے تحفظ چاہیے، محبت چاہیے، سکون

چاہیے۔ زندہ رہنا جس کا پیدائشی حق ہے۔ہم میں سے ہر ایک کو اپنے طور پر دوسروں کے غم بانٹ کر کم کرنے اور خوشی بانٹ کر بڑھانے کا عمل شروع کرنا ہوگا۔ دامے، دِرمے، قدمے، سخنے، جیسے بھی ہو۔ اگر ہم ان نیک کاموں کا تہیہ کرلیں تو عرش سے ہم پر رحمتیں برسیں گی اور فرشتے ہماری مدد کو چلے آئیں گے۔

'مخته ہار وگنڈ ءتھوہٹہِ لولو'

(اے ہار موتیوں کے، تجھے پہن لوں گلے میں)

کوہِ زَبروَن کے قدموں میں تراشے گئے، پرانے اوبرائے، نئے گرینڈ پیلس اور بالکل نئے للت سوری ہوٹل سے منسلک ہیلی پیڈ سے سرکاری ہیلی کوپٹر جب پہاڑوں کی طرف اُڑا تو کچھ ایسا عجیب نہ لگا کہ ہوائی جہاز سے نظر آنے والے منظر سے قریب تر تھا مگر صرف اپنی وادی کی سرزمین کے اوپر کی پرواز نے جہاں دل موہ لیا وہیں دل اداس بھی کر دیا۔ یہ سفر سوئے وادئ گریز تھا۔ اصل میں سرمائی مہینے زمینی سفر میں ایسی رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں کہ سفر ہی منسوخ کرنا پڑتا ہے اس لئے کہ راہیں نہایت دشوار گزار ہو جاتی ہیں اور منزل کا سلسلہ راستوں سے منقطع ہو جاتا ہے۔ سب سے قریبی منظر رائل سپرنگز کا گولف کورس تھا جو ہریالی میں جڑے پانی کے ٹکڑوں سے سجا انسانی ہاتھوں کا عجب کرشمہ معلوم ہوا جہاں گھاس ہرے رنگ کے مخمل کا پارہ سا نظر آتی تھی (یہ گھاس یورپ سے منگوائی گئی ہے اور بلو گراس کہلاتی ہے۔ اس پر چلنا پیروں کو ایسا ہی لمس بخشتا ہے جیسے کوئی دبیز کشمیری قالین پر چہل قدمی کر رہا ہو۔) اِس کے ذرا اُدھر ڈل

جھیل نظر آتی ہے مگر اس کے حسن کو بہت سی چیزیں مجروح کیے ہوئے تھیں جیسے گھاس، گدلاہٹ، گھر اور گندگی۔ آبی گھروں کی بات نہیں کہہ رہی بلکہ باقاعدہ مٹی پر تعمیر کیے گئے کنکریٹ مکانات کا ذکر ہے جو تعداد میں بہت سے ہیں۔ اوپر سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ زمینی چلن کی طرح جھیل کے کناروں میں مٹی بھر دی گئی ہے اور کئی کئی مکان ایک جگہ اِستادہ ہیں، اپنے باغیچے اور اپنا اپنا پانی لیے۔ کچھ دوری پر پھر ایسا ہی منظر نظر آتا ہے اور اس کے بعد پھر۔ یہ سلسلہ ساری جھیل پر پھیلا ہوا ہے۔ ایسے ہی جیسے زمین پر ہوتا ہے۔ طیارے اور زمین کے درمیان اگر دھویں کی دبیز چادر نہ ہو تو کھڑکی سے دور نیچے زمین پر انسانوں کی بسی دنیا ایسی ہی نظر آتی ہے۔ لمبے راستے، کھیت اور شہر۔ جہاز کے اندر نشست کے سامنے کا مونیٹر راہبری کرتا ہے کہ اِدھر امرتسر ہے اور اُدھر میر پور ہے، اِدھر پٹیالہ، اُدھر سیالکوٹ اِدھر دِلی اُدھر لاہور۔ پھر کابل، بخارہ، سمر قند، ممبئی، سری لنکا وغیرہ کی جانب تیر کی شکل کا نشان سرکتا دکھائی دیتا رہتا ہے اور خُدا کی قدرت معجزوں کی صورت جھلکتی نظر آتی ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ

مگر جھیل پر بسی بستیاں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے کسی حسین روغنی تصویر کو کسی بچے نے نادانی میں برُش چلا کر خراب کر دیا ہو۔

اس منظر کے بعد نیلے آسمان پر کہیں کہیں نظر آ رہے سفید بادلوں کے ٹکڑے بڑے دلفریب معلوم ہوئے تھے مگر بیچ پہاڑوں کے دھواں بھی اُٹھتا نظر آیا۔ جیسے شاید لوگ پتوں کو سلگا کر کوئلے بنانا چاہتے ہوں کہ خزاں کی آمد آمد تھی۔ سوچا کہ یہ دھواں بھی ماحول کو آلودہ کرے گا مگر پھر خیال آیا کہ یہ دھواں تو صدیوں سے انسان کے ساتھ رہا ہے اور یقیناً ایسا موذی نہیں ہوگا کہ یہ

کارخانوں کا دھواں نہیں تھا نہ ہی نیوکلیائی ہتھیاروں کا۔ بہر حال ابھی ایک اور دل آزار منظر نظروں کا منتظر تھا جسے اوپر سے دیکھنے پر ایسا لگتا تھا جیسے کوئی وسیع میدان ہے جس پر عجیب میلے سے رنگ کی ہریالی ہے اور گاہے گاہے درخت بھی اُگے ہیں۔ مگر یہ میدان نہیں تھا۔ ایشیا کی سب سے بڑی جھیل تھی۔ جھیل وُلر جسے انسانی ہاتھوں نے سنوارنا چھوڑ دیا تھا۔

میرا دل چونکہ بڑا حساس واقع ہوا ہے، اداس ہو گیا۔ برسات میں اُڑنے والے ٹڈِے کا ہم شکل سا نظر آنے والا ہیلی کاپٹر آگے بڑھا تو دور پہاڑی کی چوٹی پر پاکستان کی چوکی نظر آئی اور پہاڑ کے دامن میں عشقِ پیچاں کی بیل کی طرح بل کھاتی ندی کشن گنگا نے نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ اُدھر والے منسلک علاقے کو وادیٔ نیلم کہتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں کہ اس کا ہرا ہرا پانی کناروں کے ہمہ رنگ پتھروں کے درمیان سے بل کھاتا گزرتا نیلم جڑے ہار سا ہی معلوم ہوتا تھا۔ جیسے نیلم کے پتھروں کو ایک قوسیہ قطار میں جوڑ کر اطراف میں ساتوں رنگوں کے ننھے ننھے پتھر نصب کیے گئے ہوں کہ اس کے کناروں پر بے شمار رنگوں کے ان گنت پتھروں اور ہریالی نے حسن کا عجب جادو سا بکھیر رکھا تھا۔

اس منظر کی نظر نوازی سے دل میں ایک کشمیری نغمے کا مصرع گونج گیا۔

مختہ ہاروگنڈ ءتھوہٹہِ لولو

(اے ہار موتیوں کے، تجھے پہن لوں گلے میں)

مگر اس مختہ ہار کے ساتھ اِدھر اور اُدھر والوں کے جھگڑے بھی ہیں کہ پانی کس کا ہے اور بجلی کون بنائے گا وغیرہ قسم کے اور کسی نے وہاں کے باشندوں

سے اس سلسلے میں مشورہ کرنے کی بھی غالباً کبھی ضرورت نہیں سمجھی ہوگی جن کی زبان اور تہذیب کو اس اقدام سے خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ ان کی اس زبان کو بھی جو اس سرحد کے آر پار بولی جاتی ہے مگر یہاں ابھی تک اپنی قدرے اصل شکل میں محفوظ ہے اور ان کی اس تہذیب کو بھی جسے انہوں نے صدیوں سے سنبھالے رکھا ہے کہ پہاڑوں میں گھری اس وادی تک ان عناصر کی بھی کچھ ایسی رسائی نہیں ہوئی جو جدید تہذیب کے نام پر اپنی روایتوں سے کھلواڑ کرنا ترقی یافتہ ہونے کی سند سمجھتے ہیں۔ بہر حال ڈیم کا معاملہ پھر بھی اتنا آسان نہیں کہ ایسا ہونے سے پانی کا رخ بھی بدل سکتا ہے اور خطے کے اُدھر والے خاصے حصے کے ریگستان میں تبدیل ہوجانے کے خطرناک اندیشے کے علاوہ بعض دوسرے معاملات بھی سر اٹھا سکتے ہیں۔

نیلم اور جہلم ندیاں، دومیل کے علاقے میں ایک دوسرے سے مل بھی جاتی ہیں۔

گریز کی وادی پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ دراصل وادیٔ ہندو کش کے دامن میں اس وادی کے علاوہ اور مقامات بھی آباد ہیں جیسے چلاس، گوڑ، چترال، بونار، کافرستان، ہنزہ، کوہستان، ہزارہ اور گلگت کے کچھ حصے۔

(یہاں ضمناً یہ عرض کردوں کہ یہ ہزارہ وہی تخت ہزارہ ہے جہاں ہیر کے محبوب رانجھے کا گھر تھا اور جو وارث شاہ کی مشہورِ زمانہ منظوم داستانِ محبت کا ہیرو ہے جو ہیر کے گھر ملازم ہوکر ان کا گڈریا بن گیا تھا۔ رانجھے کی بنسی کی دھن سے مسحور ہیر اس کی چاہت میں گرفتار ہوگئی اور حسبِ دستور کئی مسئلے ان محبت کرنے والوں کو درپیش رہے جو جان لے کر ہی گئے۔ ان دونوں کا مزار جھنگ پاکستان میں واقع ہے۔ عاشق لوگ اُدھر آتے جاتے ہیں۔ عجب معاملہ ہے اس

محبت وُحبّت کا کہ بڑے سوال اس سے جڑے ہیں جن کا جواب ہی نہیں پھر بھی لوگ باگ عشق کرنے سے باز نہیں آتے۔)

قدیم سلک رُوٹ جو تاشقند تک جاتا تھا کشمیر سے گلگت کو جوڑتا تھا۔ گریز کی وادی میں جو طلسمی حسن پھیلا ہے اس میں سوائے فطرت کے کسی کا عمل دخل نہیں ہے۔ فُسوں کاری کی حد تک حسین اس وادی کے کچھ حصے دردستان سے بھی ملتے ہیں۔ 'پربت وہ سب سے اونچا جو ہمسایہ آسماں کا ہے' اس ندی کو ہراہرا پانی دیتا ہے۔ اس میں ننگا پربت سے بھی پانی اُتر کر آملتا ہے۔

وادی گریز سرینگر سے تقریباً ۹۰ کلومیٹر کی دوری پر ہے اور سطح سمندر سے قریب قریب گیارہ ہزار سات سو فیٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کے جنگلوں میں بُرزہ کے یعنی بھوج پتر کے درخت بکثرت ہیں جن کے تنے اور ٹہنیاں ہلکے سفید ہوا کرتے ہیں اور جن پر اپریل مئی میں شگوفے آتے ہیں کہ انہیں پنپنے کے لیے بارہ ہزار فٹ کی بلندی کا سرد موسم درکار ہوتا ہے۔ اس درمیانہ قد درخت کی شفاف چھال بڑی باریک اور تہہ در تہہ جڑی ہوتی ہے اور انگریزی میں اس کا نباتاتی نام "Betula Utilis" ہے۔ ان ہی درختوں کی چھال کا اگلے وقتوں میں کاغذ کی طرح استعمال ہوا کرتا تھا۔ کچی دیواروں میں اس کی تہیں کچی اینٹوں کی تہوں کے درمیان بچھائی جاتی تھیں تا کہ بارش اور برف کے پانی کے حتی الامکان ایک تہہ سے دوسری تک نتھرنے میں کمی واقع ہو سکے۔ ہر چھلکے پر برابر کی دوری میں تھوڑی تھوڑی لمبی لکیریں منقوش ہوتی ہیں۔ جیسے انسانی ہاتھوں نے ایک ایک یا الف الف لکھا ہو۔ (اس پر یاد آیا کہ بہت پہلے جب بچھڑے گھر کے باغ کی پرانی دیواریں دوبارہ بنائی گئی تھیں تو مٹی میں بُرزے کی تہیں ملتی رہی تھیں۔ والدہ صاحبہ نے بتایا تھا کہ یہ الف الف سا نقش اللہ کے نام کے لیے ہوا کرتا ہے

درختوں کی چھال پر۔)

گریز کے باشندے دردشین قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی بولی دردی یا شینا کہلاتی ہے۔ بٹوارے تک یہ علاقہ گلگت سے جڑا ہوا تھا۔ پہلے یہ سارا خطہ دردستان کہلاتا تھا۔ اُس زمانے میں فرنگی اس کے پانیوں میں مچھلی کا شکار کرنے آتے تھے۔

گریز کا علاقہ صحیح معنوں میں جون سے اگست تک ہی زمینی سفر کے قابل ہوتا ہے۔ ستمبر سے مئی تک یہ حسین وادی کشمیر کے باقی حصوں سے، گویا کل دنیا سے ہی منقطع ہو جاتی ہے۔ یہی حال وہاں کی کاشت کا بھی ہے۔ وہاں نسبتاً جلد تیار ہونے والے اناج کی ہی کاشت ہوتی ہے جیسے مکئی، باجرہ، جو وغیرہ۔ جو پن چکّی میں پسا کرتا ہے اور ماحول میں سوندھی سی خوشبو بکھیر دیتا ہے مگر وہاں کی عام ضرورت کے مقابل بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی زمین میں دنیا کا لذیز ترین آلو پیدا ہوتا ہے۔ اس علاقے کا سیاہ زیرہ بھی بے حد خوشبودار اور عمدہ ہوتا ہے۔ یہاں کے جنگلوں میں طبّی خصوصیات کی حامل جڑی بوٹیوں کی بہتات ہے۔

خطۂ جموں کے مختلف علاقوں راجوری وغیرہ سے خانہ بدوش وہاں اپنے مال مویشی لے کر کہیں کہیں پر ڈیرہ ڈالتے خاموش ماحول کی رونق بڑھاتے نظر آتے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑی، کشمیر کی عظیم شاعرہ حبہ خاتون کے نام سے بھی منسوب ہے۔ سارا حسن فطری ہے۔ انسان کے ہاتھوں کا کوئی احسان نہیں اس خطے پر۔ اس جگہ پر بجلی کی سپلائی تک قاعدے سے نہیں۔ بلکہ فوج ہی امداد کا ایک ذریعہ ہے۔ اکلوتے ہیلتھ سنٹر میں سٹاف اور دواؤں کی کمی ہے۔ ہر وقت انسانی جانیں ضائع ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ فوج ہیلی کاپٹر کے ذریعے نازک مریضوں

کو قریبی علاقے باانڈی پور یا دور تک لاتی لے جاتی ہے اور فوج ہی ہر شام کچھ گھنٹوں کی بجلی بھی فراہم کرتی ہے۔ جس ڈاک بنگلے میں ہمارا قیام تھا اس میں شام ڈھلے کچھ دیر کے لئے ایسا مریل سا بلب روشن ہوا تھا کہ چراغ سے بھی شرما جاتا اور حیرت یہ کہ یہ بجلی جنریڑ کی تھی کہ فضا میں کاربن مونو آکسائڈ کا ناگوار دھواں سانس لینا عذاب کیے دے رہا تھا۔ خدا جانے اس قدر زہر پی پی کر یہ جنگلات اور کتنے دن تک جئیں گے اور یہ سوچ کر حساس لوگوں کا کیا ہوگا۔ اس خیال سے رگِ جاں میں اِک ٹیس سی اٹھتی ہے۔

ضروریات زندگی کا وہ فقدان ہے اس سرحدی علاقے میں کہ الاماں۔ اس قدر سرد علاقہ اور جینے کا ایسا محدود سامان کہ انسان حیرانی سے سوچتا ہے کہ یہ لوگ کیسے اتنے سال سے حیات ہیں۔ یہ محروم لوگ کیا اتنا بھی حق نہیں رکھتے کہ انہیں خصوصی مُراعات دِئے جانے کی طرف خصوصی توجہ دی جائے کہ یہ علاقہ مشہور پچھڑے علاقوں میں بھی نسبتاً پچھڑا ہے۔ اس حسین خطے میں ہر طرح کی پسماندگی نظر آتی ہے اور پھر بھی لوگ صبر وشکر سے جیتے، اور کئی طرح کی کمیوں کے سبب آسانی سے مرنے کے باوجود آنے والوں کی طرف نرم سی مسکراہٹ پھولوں کی مانند اچھال دیتے ہیں۔ مجھے ان کی ہر ادا میں اپنے تئیں محرومیوں کے خلاف طنز نظر آیا۔ خدا جانے اوروں کو کیا نظر آتا ہو۔ یا پھر یہ میرے دل کے اندر چھپی وہ شرمندگی تھی، جو رہ رہ کر مجھے احساس دلاتی تھی کہ اگر میں یہاں مچھلی کا شکار کرنے یا ان سے جھوٹے وعدے کرنے نہیں آئی تو پھر ان کے لیے کچھ کیوں نہیں کر سکتی۔ مگر ہاں کر سکتی ہوں کہ میں انہیں ان کے پیہم استقلال کے لئے سلام تو کر ہی سکتی ہوں۔

☆☆

پانی کا پیالہ اور آگ کا برتن

حال ہی میں بیس اکیس اکتوبر کو امرتسر میں سارک صوفی فیسٹیول منعقد ہوا۔ حسبِ دستور جنوب ایشیا کے آٹھ ممالک سے فنکاروں اور دانشوروں کو مدعو کیا گیا۔ تقریباً ایک سے رنگ کے، عموماً ایک سی قامت کے اور خصوصاً محبت کے یہ لوگ ایک پلیٹ فارم پر نظر آئے تو حضرتِ انسان کی تخریب کاریوں سے تباہ حال اس کرۂ ارض کے لئے شعوری طور پر پریشان ذہن کے سکون اور چین کے غیر شعوری انتظار کے خاتمے کی کچھ امیدیں بندھتی بھی محسوس ہوئیں کہ گویا اب وہ دن دور نہیں جب تمام عالم میں امن قائم ہو جائے گا۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ فن جب بھی زندہ تھا جب سائنس نہیں تھی اور فنونِ لطیفہ سے وابستہ ہر انسان بھی ہر دور میں اہم اور محترم رہا ہے۔ ہم نے یہ بات بھی بارہا محسوس کی کہ قریب قریب ہر عورت بذاتِ خود صوفی ہوتی ہے خواہ وہ کسی درویشانہ سلسلے سے کبھی واقف رہی ہو یا نہیں کہ خلوص بانٹتی ہے اور قوتِ برداشت سے کتنے ہی مسئلوں کو الجھن بننے سے پیشتر حل کر دیتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کے لیے درد کا حد سے گزر جانا کبھی دوا نہیں ہو پاتا بلکہ تا عمر زخموں کو سینچ سینچ کر تازہ رکھتی ہے اور یہی وہ بات ہے جو دنیا سے آخر کار مغرور طاقتوں کے زور کو ختم کرے

گی کہ اس کا ذہن و دل بھی کُل عالم میں سکون ہو جانے کی تمنا میں کچھ نئی راہیں دریافت کرنے میں لگا رہتا ہے جو سب کی سب ہری بھری پگڈنڈیوں سے ہوتی ہوئی پانیوں وادیوں اور پہاڑوں کو جاتی ہوں کیونکہ گھر اِن ہی چیزوں کے کناروں پر آباد ہوتے ہیں اور خشک، سنگلاخ اور سوختہ زمین بھی سینچی جائے تو ہری ہو اٹھتی ہے۔اس فیسٹیول میں پاکستان سے بھی لوگ آئے تھے جن میں سے تین خواتین نے ہمیں اپنی کتابوں سے نوازا۔ہال میں اپنی نشست پر بیٹھنے کے کچھ لمحے بعد ہی ہمارے برابر تشریف فرما خاتون، نسرین انجم بھٹی نے اپنی پنجابی شاعری کی کتاب عنایت کی۔

'اٹھے پہر تراہ'، ایک ایسا عنوان جو موجودہ دور کا استعارہ بھی ہے اور ایک شاعرہ کے داخلی جہان کی ترجمانی بھی۔ دل کو چھونے اور ذہن کو سوچنے پر مجبور کرنے والی یہ شاعری متحیّر کیے دیتی ہے، کہ نازک سے وجود والے چھوٹے سے سر میں کیسی کیسی تشبیہیں، کیسے کیسے استعارے، اور معنیٰ کی کیسی کیسی وسعتیں پنہاں ہیں جو پڑھنے سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔

ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں،

کس دیس گھٹائیں مار کرن
کیوں ویڑھے شاماں در آئیاں
اُڈ گئے کبوتر کھوہاں دے
جد خالی اکھیاں بھر آئیاں
ہریاول مچی اندراں وچ
کندھاں تے کائیاں چڑھ آئیاں

کلبوت تیار پئے تھیندے ہُن

اَساں دے آئے ہاں مُڑ سائیاں

ایہہ دھپاں چھاواں پی ڈیکھوں

ساکوں ننگے پنڈڑے کڈھ سائیاں

اساں پچھیاں تچھیاں سن مٹھرا

پھٹ سہیڑ تے لوناں اکھوائیاں

جت کھنڈ دے کھیر ملیندے ہائے

اوس چونکے کیڑیاں بُھوں آئیاں

اس کے کچھ وقت بعد ذہین آنکھوں اور متین مسکراہٹ والی عائشہ ذی خان نے ہمیں ایک اور تحفے سے نوازا جو ان کی انگریزی نظموں کا مجموعہ، Building Bridges تھا جس کے سب اوراق پر ہندو پاک کے مشترکہ نقشے کے پس منظر میں ایک ایک نظم سجی ہے جس میں محبت، معصومیت اور انسانیت کے علاوہ ایک پُرسکوں جہان کا خواب صاف عیاں ہے۔ایک نظم کا یہ بند ملاحظہ ہو،

The Olive branch with love

In humanity's treasure trove

To bring about a holy peace

Destruction put to cease

ان کی ایک اور نظم کے کچھ حصے ہم نقل کرتے ہیں،

Oligarch from states to people

Are visible on the easel

Examples in history razzmatazz

This centuries old system that has

Europe to India to Central America or medial

Politics to controle land is evil

Severe inequality in income and wealth act as

Power in the hands of rich minority collapse

انہوں نے ہمیں ایک اور کتاب بھی عنایت کی جس میں انہوں نے سارک ملکوں کے کئی فکشن رائٹرس کی کہانیاں شائع کی ہیں۔

آخری کتاب اردو شاعری کی تھی، ''مجھے خطبہ نہیں آتا''۔اس کتاب کی خالق پُرسکون چہرے پر پُر احتجاج آنکھوں والی جہاں آرا تبسم ہیں۔طوفان سے پہلے کے خاموش سمندر ایسی ٹھہری ہوئی تانیثی شاعری۔ایسا طنز کہ ظالم تلملا اٹھے اور مظلوم کے چہرے کی اذیت مسکراہٹ میں تبدیل ہو جائے۔ان کی ایک نظم، ''موت مسکراتی ہے'' ملاحظہ کیجئے،

میں دفتر جاؤں یا بازار جاؤں

میں اپنے دوستوں، غیروں میں، اپنوں میں

جہاں بھی ہوں

مجھے میرا بدن تکلیف دیتا ہے

مرے نازک بدن پر

اَن گِنت نظروں کے

ایسے زخم لگتے ہیں کہ جن کو۔۔۔

صرف میں محسوس کرتی ہوں

میں اپنے آپ کو آلودہ لگتی ہوں

بہت ہی ٹوٹ کر!
تھک ہار کر!
واپس پلٹتی ہوں
جہاں بستر پہ میری ''موت''
مجھ کو دیکھتی ہے
مسکراتی ہے۔

دیانت داری سے غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ صِنفِ قوی نے یہ دنیا تباہ کر دی ہے۔ اسے اب صِنفِ نازک کے سپرد کر دیا جانا چاہیے جہاں اَنا کے مسئلے ہوں نہ طاقت کے مظاہرے کا ارمان۔ ابوغرائب کے جیل اور گجرات کی ہلاکتوں میں حصہ دار عورتوں پر تو ہمیں یہی شبہ ہے کہ اس کے پیچھے بھی مرد کا ذہن کارفرما ہوگا مگر پھر خیال آتا ہے کہ دنیا میں ذہنی مریضائیں بھی پائی جاتی ہیں۔ ساری تباہی اور بربادیوں سے بچنے کا ایک اور طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کرۂ ارض کو فن کاروں کے حوالے کر دیا جائے کہ سچے فن کار صوفیوں سے کم نہیں ہوتے اور اگر بغور دیکھیں گے تو ان کے ایک ہاتھ میں رابعہ بصری کی طرح پانی سے بھرا پیالہ اور دوسرے میں آگ کا برتن نظر آئے گا۔

☆☆

پیار کے لوگ آگے نکل جائیں گے

دیکھا جائے تو عرصۂ دراز سے حضرتِ انسان کے تخریب کار ذہن کو شُکھ سے بیر سا ہو گیا ہے۔ کچھ وقت اگر کوئی خوں ریزی نہیں ہوئی تو خوامخواہ کسی کو پکڑ کر حفاظت کے نام پر بند کرنا بڑے دنوں سے ایک عام سی خبر ہو گئی ہے۔ عجب بیمار نظریہ ہے کہ ملک کے مستقبل کے ضامن نوجوانوں کی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ جیل کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو پھر برسوں بعد باعزت بری ہو کر ایک بڑا سا سوال بن جاتے ہیں جسے حل کرنے میں عمرِ رواں کا ایک اور بڑا حصہ صرف ہوتا ہے اور وقت کے ہر تقاضے میں دیر ہوتی چلی جاتی ہے کہ تعلیم ادھوری ہوتی ہے، روزگار کا دور دور تک پتہ نہیں ملتا اور گھر بسانے کی عمر تقریباً نکل چکی ہوتی ہے۔ اور پھر یہ بھی بیمار نظریے کے بہت سے حمایتیوں نے پہلے ہی سوچ رکھا ہوتا ہے کہ کس کس متبرک دن کے ساتھ کون کون سا سیاسی فائدہ جوڑا جائے گا۔ عیدوں اور جُمعوں کو بم اُڑانا، عبادت گاہوں کو تاراج کرنا، محرّم، میلاد اور دعائیہ مجلسوں اور دوسرے جلوسوں میں نہ جانے کن ذہنی حالات کے زیرِ اثر اور کس منطِق کے تحت بے خبر بے گناہوں کی جانیں لینا اور لوگوں کو زندگی بھر کے لئے معذور و مفلوج کر دینا یا دیوی دیوتاؤں کے جلوسوں میں رخنہ ڈالنے کے بہانے

اقلیتوں کو تشدد کا نشانہ بنانا اور نئے سال کی اور دوسری تقریبات پر خون خرابے پیدا کرنا بھی روایتی خبروں میں شامل ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ بے سبب جانیں لینے والے یا تو اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتے یا پھر اپنی جان سے اس طرح محبت کرتے ہیں جو دوسروں کی جان لینے پر منحصر ہو۔ ایسے میں وہ اپنے عزیزوں کو بھی بھول جاتے ہیں کہ ان حادثات کا ان پر کتنا دیرپا اور خطرناک اثر ہو سکتا ہے۔ جن زمینوں پر کئی تہذیبیں یکجا ہوں وہاں پھوٹ ڈالنا آسان ہوتا تو ہے مگر جب ممالک بالغ ہو جائیں تو قائدین حضرات تجربات سے سیکھتے ضرور ہیں البتہ اس کا اِطلاق نہ کرنا عام طور پر ضروری نہیں سمجھتے۔ بعد کو خواص تو ملک غیر ملک میں مال جمع کیے رکھتے ہیں اور عام انسان سوچتا ہے کہ اور کئی ممالک تو اس قدر آگے بڑھ رہے ہیں، اور ہمارا ایسا حال کیوں ہے۔ تو وہ اسی لیے کہ پھوٹ ڈال کر حکمرانی کرنے کی ترکیب محض گورے صاحب کی ہی نہیں، اپنے بھورے صاحب بھی اس میں کچھ کم نہیں ہیں۔

تم تو کوئی قفقاز نہ تھے، پَر نوچنے والے باز نہ تھے
بھورے صاحب کیوں بدل گئے، پہلے تو یہ سب انداز نہ تھے

(ت ر)

بھورے صاحب یہی تو کر رہے ہیں سرحد کے دونوں طرف، کبھی مذہب کو لے کر کبھی مسلک کو لے کر، کبھی خطے کو لے کر، کبھی زبانوں اور بولیوں کو لے کر۔ گویا بھولے انسانوں کو ان عام مسائل میں الجھائے رکھو اور خود بڑے بڑے فوائد حاصل کر کے اپنی آنے والی پیڑھیوں کی دنیاوی بقاء محفوظ کر لو۔ آخرت کا خوف ایک اندر کا معاملہ ہے، پھر ضمیر وَمیر جیسی چیزوں سے ایسے اذہان کا کیا لینا دینا۔

ایک تو اس دور کو اب مدتوں سے ایک ایسی جابر طاقت سے واسطہ ہے
جو صرف اور صرف لالچ کی خاطر اور محض زور زبردستی کی بنیاد پر خود کو عظیم کہلوانے
پر تلی ہے۔ کسی بھی ملک پر بہانے بنا کر حملہ کرنا اور صدیوں پرانی تہذیبوں کو
نیست و نابود کرنا اس کی جدّت طبعی میں شامل ایک اہم عنصر ہے۔ اور دوسرے یہ
کہ خود بھورے صاحبان میں بھی ایسے لوگ ہیں جو کسی نہ کسی طرح انہیں کا انداز
اپناتے چلے جا رہے ہیں اور ایک کھوکھلے اونچے طبقے پر فخر کرنے میں کوشاں ہیں
جو محض دولت کی بنیاد پر ایستادہ ہوا چاہتا ہے، بھلے ہی اس میں اخلاق و آداب،
تہذیب و تمدن، اور حب الوطنی ہی کیوں نہ داؤ پر لگتی جائے۔ اس سے ہوتا یہ ہے
کہ رفتہ رفتہ دنیا میں دو طبقے واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک ان کا جو غریبی کی سطح
سے نیچے ہیں اور فنا ہو رہے ہیں اور دوسرے وہ جو خود پر جانے انجانے ایک ایسا
طرزِ زندگی طاری کر رہے ہیں جس میں وہ ان چیزوں کی قیمتیں ادا کرنے میں
اپنی تنخواہوں کا بڑا حصہ عمر بھر قسطوں میں چکاتے ہیں، جن چیزوں کی ان کو
ضرورت ہی نہیں ہوا کرتی۔ ایک تو اس بات میں اوسط طبقہ اس قدر مصروف ہے
کہ حالات کی بابت سوچنے کی اس کے پاس ایک گھڑی نہیں بچتی۔ دوسرے اس
رجحان سے اس میں سے بعض تو اسی نام نہاد اونچے طبقے میں شامل ہو رہے ہیں
اور باقی تیزی سے غریبی کی طرف ڈھلکتے جا رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو اس سب
کی ذمہ داری ذرائع ابلاغ کے بے مہار اور غیر ذمہ دارانہ رویّے پر بھی عائد ہوتی
ہے کہ اس کی ڈور بھی سرمایہ دار کے پاس ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اوسط طبقہ
اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ دنیا میں ہر طرح کی ناانصافی کو ختم کرنے میں اہم
کردار ادا کر سکے بشرطیکہ وہ کسی مشترکہ سوچ کے زیرِ اثر عمل پیرا ہو۔ مگر اسے ہم
چشمی سے اور اکثر و بیشتر ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش سے ہی

فرصت نہیں ملتی۔ لالچ اسے چین نہیں لینے دیتا اور خود غرضی اسے دوسروں کے بارے میں سوچنے نہیں دیتی۔ باقی بچتے ہیں محبتوں کے لوگ جو نفرتیں سینچنے میں وقت نہیں گنواتے۔ جن میں قلم والے ادیب بھی ہیں اور مُوقلم والے مصور، تصویر اتارنے والے مشاق دست بھی اور دیانت دار صحافی بھی، چھینی اور ہتھوڑی والے سنگتراش بھی اور مجسمہ ساز بھی، خوش قدم رقاص بھی اور خوش لحن گلوکار بھی، فلم والے بھی اور سٹیج والے بھی۔ غرض یہ کہ ہر فنکار، چونکہ ذہین و فطّین ہونے کے علاوہ نرم دل اور متین واقع ہوا ہے، اس کا اہل ہے۔ اگر ان کے ساتھ وہ طبقہ بھی آن جڑے جو استحصال شدہ طبقے کے لئے متفکر رہتا ہے تو دنیا میں سکون ہو جائے گا اور حساس دلوں کو چین مل جائے گا۔

نفرتیں سینچنے میں نہ الجھے رہو
پیار کے لوگ آگے نکل جائیں گے

(ت ر)

رشتے، انا اور معصومیت

حال ہی ممبئی کی ایک عدالت نے ایک طلاق شدہ جوڑے کا بچہ، ماں کی حفاظتوں سے لے کر باپ کے سپرد کر دیا۔ یہ بڑی تعجب خیز سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ علیحدگی کے وقت سن، ننیانوے میں جب بچہ چھوٹا تھا تو عدالت نے الگ ہوتے ہوئے میاں بیوی میں سے بچے کی تحویل کی خاطر اس کی ماں کا انتخاب کیا تھا۔ اب ایسا کیا بدلاؤ پیدا ہوا کہ عدالت کو یہ فیصلہ بدلنا پڑا۔ خبر پڑھ کر انسان سوچ میں پڑ سکتا ہے۔ اور مزید تجسّس کی تسکین کے لیے معاملے کی تہہ میں جائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اصل میں کُل عالم کے حالات نہایت تیزی سے بدل رہے ہیں۔ یہ تو پرانے زمانے سے سنا جاتا رہا ہے کہ زمانہ بدل رہا ہے مگر اس دفعہ کچھ ایسی تیزی سے بدل رہا ہے کہ خود انسانی ذہن ہی اسے قبول نہیں کر پا رہا۔ ایک زمانے میں گیارہ بارہ برس کے بچوں کی شادیوں کی رسمیں نبھا دی جاتی تھیں۔ کئی دیہات میں اب بھی ایسا ہو رہا ہے۔ بھلے ہی بچے پھر اپنے اپنے گھروں میں کھیلتے رہتے ہوں۔

(اس پر مجھے اپنے ایک پسندیدہ گلوکار غلام حسن صوفی کا ایک کشمیری نغمہ یاد آتا ہے کہ 'افسوس دنیا کانئہ نالوگ سمسار سیتی ...... فنی بندشوں سے ذرا صرفِ

نظر کر لینے میں اگر کوئی حرج نہ سمجھا جائے کہ مقبولیت اور فنی باریکیاں دو جدا چیزیں ہوا کرتی ہیں، تو صدی بھر پہلے دنیا میں آئے شاعر مرحوم و مغفور رجب حامد کے اس معروف گیت کو صوفی صاحب نے اپنی پُر درد آواز سے لا فانی بنا کر جہاں بے ثباتیٔ دنیا کا ذکر کیا ہے وہیں بچپن میں میّسر ناز و نعم، لوریاں، پالنے سے لگی گھنگھریاں، پھر تین سال کی عمر میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے گھر سے نکلنا اور سات سال میں مکتب میں داخلے کے بعد اگلا قدم بارہویں برس میں صاحبزادے کے گھر بسانے کا ہے اور پھر رفتہ رفتہ وہی اولاد کے ہاتھوں بے قدری پھر بیماری اور ضعیفی وغیرہ کی کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی۔ گویا پچاس پار کرتے سارے معاملات تمام، جبکہ خود شاعر صاحب ماشاءاللہ سے ایک سو پانچ برس جیے)۔

معاشرہ سمجھتا تھا کہ یہی عمر ہے بچوں کے گھر بسانے کی اور بعد کو یہ گمراہ ہو سکتے ہیں۔

معاشرہ جب بھی کچھ صحیح نہیں سمجھتا تھا اور معاشرہ اب بھی یہ نہیں جانتا کہ اب تو بچے پیدا ہوتے کے ساتھ ہی بالغ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ان کی ذہنی صحت ہر دور کی نسبت اب زیادہ قابل اعتماد ہے۔ مثال کے طور پر والد کو سپرد کیے جانے والا بچہ گیارہ برس کا ہے۔ اور بنیاد یہ بتائی گئی ہے کہ سات سال کی عمر کے بعد، مسلم لاء کے مطابق بچے کا باپ ہی اس کا اصل محافظ ہوگا۔ جج صاحب نے ظاہر ہے کہ منصفانہ فیصلے کی خاطر خود بچے سے اس کی مرضی پوچھی۔ معلوم ہوا کہ بچہ ہی اس بات کا خواہاں ہے کہ وہ آگے کی زندگی والد کے ساتھ گزارے گا۔ اس لیے کہ اس کے والد دولت مند ہیں اور اس کی پرورش کہیں بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔ جج صاحب اس کی ان بڑی بڑی باتوں سے حیرت زدہ تھے۔

میں نے اخبار ہاتھ میں لیے حسب عادت سر اٹھایا اور گولر اور نیم کے

درختوں میں آتی جاتی چڑیوں کو دیکھنے لگی۔ بڑی گرم صبح تھی۔ اتنی صبح ہو کر بھی ایک کوا منقار وا کیے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ اسے مارے گرمی کے پیاس لگی تھی۔ سامنے کے باغ میں بجلی محکمے کے کسی نہایت بد ذوق افسر نے عین درمیان ایک دیو قامت کھمبا نصب کرا دیا تھا۔ ہری گھاس اور پھولوں کی کیاریوں والا چھوٹا سا چوکور باغ۔ ہر گوشے اور کنارے پر ہرے ہرے درخت اور درمیان میں ایلومینیم کا چار بڑے بڑے شیشے کے چھجوں والے، تیز بلبوں والا قوی ہیکل کھمبا جس پر اونچی عمارتوں کے اوپر تک خاصی تگ و دو کے بعد پہنچنے والی سورج کی پہلی کرن پڑتی تو اس سے منعکس ہو کر پھیلنے والی کرنیں سبز و شاداب فضا میں مداخلتِ بے جا معلوم ہوتیں۔ میری نظریں اس آہنی دیو کی گستاخیوں کی جرأت سے نبرد آزما ہی تھیں کہ آناً فاناً میں کالے گھنے بادل گھر آئے اور کہیں قریب ہی اس زور کی بجلی کڑکی کہ دل دہل گیا۔ پھر تیز ہوا چلی اور چھینٹے پڑنے لگے۔ اس سے پہلے کہ اخبار، موبائل اور اپنی چھوٹی سے دوربین (جو میں چڑیوں کا مشاہدہ کرنے کے لئے اکثر ساتھ لیے پھرتی ہوں) سمیٹ کر میں اندر کی طرف بھاگتی، ہوا بادلوں کو کسی اور طرف لے گئی اور بارش نے بھی منہ موڑ لیا۔ میں پھر اخبار پر جھک گئی۔ داہنی جانب ذرا آہٹ ہوئی تو دیکھا کہ ملازم چائے کی کشتی لیے کھڑا ہے۔ وہ اپنے طے شدہ وقت سے گھنٹہ بھر پہلے ہی بیدار ہوتا نظر آیا تو حیرت ہوئی۔ پوچھا تو بولا کہ ''اتنا جور شے بجلی کڑکا، ہم سمجا ہمارے شر پر گرا ہے۔'' میں اس کی بات سے محظوظ ہوا چاہتی تھی کہ خیال آیا اس خبر کے بارے میں اس کی رائے جانوں۔ اس کی عمر انیس سال کے قریب ہوگی اور وہ ہمارے پرانے نیپالی ملازم کی جگہ (جو چھٹی پر گیا تھا) اس کا چچازاد ہونے کے ناطے کچھ مہینوں کے لیے آیا تھا۔ اس نے ساری بات غور سے سنی تو بڑی سنجیدہ سی شکل بنا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا

کہ عقلمند آدمی کچھ بول تو سہی تو بولا کہ ''میم شاب آپ کیشا سوال کیا۔ کیا بولے گا۔؟'' مجھے محسوس ہوا کہ اسے اپنے والدین کی یاد آتی ہوگی کہ ہولی پر وہ اسی شہر میں اِدھر اُدھر کام کرنے والے اپنے گاؤں کے لوگوں سے ملنے گیا تھا تو اس کے والدین کسی رشتہ دار کے گھر میں تھے جہاں کسی کے موبائل پر اس نے ان سے بات کی تھی۔ اس دن شام کو لوٹ کر آیا تو چپکے چپکے رو رہا تھا۔ ہم سب نے بڑے جتن سے اس کا موڈ ٹھیک کیا تھا۔ ہچکیاں لے لے کر کہہ رہا تھا کہ ''ماں بولتا ہے کہ گھر اچھا نہیں لگتا۔ تم تینوں بہن بھائی باہر ہو۔ دسہرے کی چھٹیوں تک کیشے وقت کاٹیں گے''۔ میرے ذہن میں یہ بھی خیال ابھرا کہ سوچ رہا ہوگا کہ میں تو والدہ کے تئیں اس کا رویہ جانتی ہوں تو پھر یہ کیوں پوچھ رہی ہوں۔ ہونقوں کی طرح دیکھتا رہا تو میں نے پھر سوال کیا۔

''یہ بتا کہ اس گیارہ سالہ لڑکے نے ماں کو چھوڑ کر اچھا کیا یا برا۔؟''

اس نے گردن کو خم دیا اور کشتی میز پر رکھنے لگا۔

''برا کیشے کیا، جدھر اُش کا جندگی اچھا ہوگا، ادھر ہی گیا نا۔''

وہ ٹرے رکھ کر سیدھا ہو گیا۔

''اسے ماں کی یاد نہیں آئے گی جس نے اتنے سال پالا پوسا بڑا کیا۔؟''

''نہیں آئے گی میم شاب۔ اچھا کھائے گا، اچھا پہنے گا۔ تو کیدھر شے یاد آئے گا۔ میں خوش ہوں تو گھر کا یاد آتا نہیں ہے مجھے۔''

وہ بڑی سادگی سے بولا اور چائے بنانے لگا۔

''تو پھر اس دن، ہولی کے دن رو کیوں رہا تھا۔''

وہ میری بات سن کر اس زور سے ہنسا کہ ہاتھ میں تھاما، شکر سے بھرا چمچ چھلک گیا۔

''یاد تو کبھی آئے گا، اُش شے کیا ہوتا ہے۔؟ پھر جادہ تو بھول ہی جاتا ہے، اپنا جندگی بنانا ہے نا انشان کو۔''

چائے میرے ہاتھ میں دے کر وہ کھڑا میرے اگلے سوال کا منتظر رہا۔اب میں اسے بے وقوفوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے جاؤ۔''

میں نے نرمی سے کہا تو وہ ہنستا ہوا اندر کی طرف مڑا۔مگر میرے چہرے سے شاید وہ احمقانہ تاثرات کافی دیر تک گئے نہیں تھے۔کیا مسئلہ صرف ضرورتوں کا ہے یا کہ دوریوں کی ذمہ دار دوسری چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ملازم والی بات بھی انسانی نفسیات کے ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے مگر جہاں شدید محرومیوں پر مبنی ایسے مسائل نہ ہوں وہاں کون سا عنصر رشتے توڑتا ہے۔

مجھے ملیالم شاعر 'اَیی یپّا پانی کر' کی ایک نظم یاد آرہی ہے جس کا عنوان ہے Video Death جس میں غیر ملک میں رہ رہا ایک بھائی وطن سے ماں کے قریب المرگ ہونے کی خبر سن کر بہن کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ ماں کی موت اور آخری رسوم کی ایک مکمل ویڈیو فلم بنا کر اسے بھیج دے کہ وہ خود مصروفیت کے سبب آنہیں سکے گا۔اب دیکھا جائے تو یہ انہونی سی معلوم ہوتی ہے مگر دوسرے ممالک کو جانے والوں کے، سانس لینے کے حقوق کو چھوڑ کر تقریباً تمام حقوق تنخواہ کے عوض خرید لیے جاتے ہیں، چھٹیاں بہت کم، سفر کے کرائے زیادہ اور کئی دوسری چیزیں۔اس کے علاوہ اگر یہ بندشیں نہ بھی ہوں پھر بھی پردیس جانے والے اپنی نئی زندگیوں میں مشینی پُرزہ سا بن کر مطمئن رہنا سیکھ لیتے ہیں۔اس میں جذبات کی کمی کی کیا شکایت، یہی ہو رہا ہے جہان بھر میں۔گاؤں سے روزگار کے لیے لوگ قصبوں اور شہروں کو جاتے ہیں۔شہر والے بڑے شہروں کی طرف اور بڑے

شہروں کے باشندے بڑے ملکوں کی طرف۔ یعنی آگے، آگے اور آگے، پھر کہاں، یہ کوئی نہیں سوچتا۔ اولاد کے آخری سانس لیتی ماں کے قریب ہونا، ممکن نہیں معلوم ہوتا تو ایسے میں Video Death کسی یاد کا کام دے سکتی ہے۔ یہ پھر انسان کے ضمیر پر منحصر ہے کہ وہ اس سے کس درجہ غم، محبت، احساس ذمہ داری یا اس کا فقدان محسوس کر سکتا ہے۔

اب اخبار کی خبر کی طرف واپس جایا جائے تو جج گیارہ سالہ بچے کی باتوں کی سچائی کی نفی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جو بچہ گیارہ برس تک اپنی ماں کا سہارا رہا، اس کے جانے سے ماں کے دل پر جو بیتی ہوگی یا جو بیتا کرے گی وہ ایک تلخ اور تکلیف دہ سچائی تو ہے ہی مگر اس فیصلے سے بچے کے باپ کو جو تسکین حاصل ہوئی وہ بھی کسی تلخ ترین حقیقت سے کم نہیں۔ اس سارے جھگڑے کی جب گیارہ برس پہلے بنیاد پڑی ہوگی تو کیا بغیر علیحدگی کے اس کا کوئی دوسرا حل نہیں ہوگا۔ کیا علیحدہ ہو کر واقعی مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ کیا الگ ہو کر لوگ واقعی اپنے طور پر کامیاب زندگیاں گزارتے ہیں۔ کیا ان کی زندگیوں میں پہلے جیسے مسئلے دوبارہ نہیں اٹھتے۔ اور کیا علیحدگی اتنی ضروری ہو جاتی ہے کہ اولاد کی، والدین میں ایک سے دوری ہو جائے؟ وہ ننھی سی جان جسے ماں کی گود کی نرماہٹ اور باپ کے بازوؤں کی مضبوطی ہمیشہ درکار رہتی ہے، اس کی زندگی میں ایک ادھورے پن کی بنیاد نہیں پڑ جاتی؟ کیا نیند سے بیدار ہو کر اپنے اطراف دونوں کی موجودگی بچے کا پیدائشی حق نہیں ہے۔ کیا ہمارے بزرگوں نے زندگیاں بیس، تیس، چالیس یا زیادہ برس تک ایک دوسرے کے ساتھ نہیں گزاریں۔ اور ایک چھت تلے رہنے والے والدین کے محفوظ ماحول میں پلی اور پروان چڑھی اولاد بٹے ہوئے والدین کی اولاد سے بہتر ثابت نہیں ہوگی۔ اور کیا ساتھ رہنے والے واقعی ایک

دوسرے کے لئے بنے ہوتے ہیں۔ اور کیا شادیاں واقعی 'Heaven' میں طے ہوتی ہیں، یہ ایک الگ بحث ہے۔ سچائی یہ ہے کہ ہر انسان کا مزاج دوسرے سے مختلف ہوا کرتا ہے بھلے ہی وہ جڑواں کیوں نہ ہوں۔ سارا معاملہ سوچ سمجھ اور حالات کے سنجیدہ پہلو کو جانچنے کا ہے۔ رشتے نبھانے کا ہے۔ یہ لَو میرتجیز، یہ کورٹ شپ، یہ انڈرسٹینڈنگس، دیکھا جائے تو محض اصطلاحات ہیں۔ زندگی کی حقیقتوں سے، حقیقتوں کی نزاکتوں سے، نزاکتوں کے تئیں حساس نتائج سے ان کا کوئی تعلق ثابت ہی کہاں ہوتا ہے۔ تو طے ہوا کہ سارا جھگڑا اَنا کا ہے۔ دو میں سے جب ایک، دوسرے کی شناخت کو چیلنج کرنے لگتا ہے تو مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے اور دوسرا یہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا اس کا اپنا کوئی وجود ہی نہیں۔ اس وجود کو منوانے میں وہ تیسرے کی نہیں سوچتا۔ وہی تیسرا جو اصل میں دونوں کی ترجیحات کا اولین باب ہے۔ وہی تیسرا جس کی معصومیت دو اَناؤں کے ٹکرانے سے مجروح ہو جاتی ہے۔ وہی تیسرا جو پھر تمام عمر عدم تحفظ کا شکار رہتا ہے۔

پیرانِ پیر حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے روایت ہے کہ انہیں تلاوتِ کلام پاک میں اکثر مشغول والدہ کی برکت سے شکمِ مادر میں سنی ہوئی آیتیں دنیا میں تشریف لانے پر ازبر تھیں۔ سائنس نے اب یہ بات ثابت کی ہے کہ ماں کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی حالت کا اثر fetus پر پڑتا رہتا ہے اور دنیا میں آنے کے بعد ان ہی چیزوں کے زیرِ اثر اس کی شخصیت پنپتی ہے۔ اسی طرح اولین ایاّم میں وقوع پذیر ہوئے واقعات تک انسان کے پورے وجود پر اثر انداز رہتے ہیں، چاہے اسے یاد نہ بھی ہوں اور کبھی کسی ذکر سے جڑی کوئی یاد، کسی بہت پرانے واقعے کو کمپیوٹر کی ونڈو کی طرح کھول کو ذہن کے اسکرین پر لے آتی ہے۔

ممبئی کی عدالت سے بچے کی جنگ جیت لینے والے کی اَنا کو وقتی تسکین تو حاصل ہوگئی مگر وقت اسے بار بار اس بات کا احساس دلائے گا کہ بچے سے اس کی ماں دور ہے۔ جس ماں کو اولاد نے دیکھا تک نہ ہو وہ اولاد بھی تمام عمر اپنے لاشعور میں ماں کا غم پالے رکھتی ہے۔ جیتی جاگتی ماں سے دوری جب جب گیارہ سالہ بچے کو غمزدہ کرے گی اس کا اثر ماں اور باپ دونوں کے دلوں پر ہوتا رہے گا۔ میلوں دور رہ کر بھی کہ دل کو دل سے راہ ہوا کرتی ہے۔

گھر بنے سنورے ہی گھر ہوا کرتے ہیں۔ جنم دینے کے بعد والدین کی ذمہ داریاں ختم نہیں ہوتیں، شروع ہوتی ہیں کہ دو لوگوں کے ساتھ دوسری زندگیاں بھی آن جڑتی ہیں۔ رشتہ سمجھوتوں کا نام ہے۔ ورنہ پھر مغرب کے زیرِ اثر، شادی کی اہمیت ہی ختم ہو جائے گی۔ لوگ الگ ہوتے ہوئے اتنے الگ ہوں گے کہ کوئی مستقل رشتہ غیر اہم ہو جائے گا وہاں کے اکثر بچوں کی طرح یہاں بھی بچے کہیں گے کہ ان کے ماں اور باپ کے دو گھر ہیں مگر ان کا اپنا گھر کوئی نہیں۔

آج کی نسل کا نعرہ یہ ہے کہ انسان وہی حاصل کرتا ہے جس کا وہ خواہاں ہوتا ہے۔ تو معاملہ یہ ہے کہ گھر کے سکون کی خاطر اگر ایک فریق مسلسل برداشت کرتا ہے تو دوسرے کو اس کا غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے اور برداشت کرنے والے کو (جو اکثر و بیشتر برداشت کرنے والی ہوا کرتی ہے) ایک حد کے بعد احتجاج ضرور کرنا چاہیے تا کہ اس بات کا احساس فریق کے اندر زندہ رہے۔ مگر احتجاج کا طریقہ علیحدگی نہیں ہے۔ اپنے لئے سکون سے سانس لینے کی جگہ پیدا کرنا ہے۔ صارفیت کا یہ دور بڑا ظالم دور ہے۔ اپنی سہولت کے لئے جب اولاد ماں سے الگ ہونے کو ترجیح دیتی ہے تو اور زیادہ سہولیات کے لئے کیا باپ

سے دور نہیں ہوسکتی۔ جو باپ اپنے بچوں کے سامنے ان کی ماں کی عزت نہیں کرتا اور نتیجتاً بچے بھی جب ماں کی عزت کرنا نہیں سیکھتے، تو بڑے ہوکر باپ کا ڈر ختم ہوتے ہی باپ کی بھی عزت نہیں کرسکتے کیونکہ کوکھ میں سنبھالنے والی بہر طور بچے کے ذہن میں افضل ہی رہتی ہے۔ سب باتوں کا احساس ہونے میں عمرِ عزیز کا بڑا حصہ گزر جاتا ہے۔ ایسا ہونا اس رشتے میں بندھے ہر فرد کے دکھ کا باعث ہو جاتا ہے۔ باپ کے لیے پچھتاوے کا دکھ، ماں کے لئے اپنی مجروح کردی گئی شخصیت کا دکھ اور اولاد کے لیے حالات کو غلط انداز سے سمجھ کر شدید ردعمل کا دکھ۔ پھر لاشعور میں آخری دم تک ایک دکھ ساتھ ساتھ زندہ رہتا ہے۔ زندگی دکھوں کا ہی تو نام نہیں ہے۔

سِن رسیدہ بچپن اور ناعاقبت اندیشی

کچھ تین ایک سال قبل ساہتیہ اکادمی کے اردو ایڈوائزی بورڈ کی میٹنگ کے لیے کلکتے جانا ہوا تھا۔ کام کے علاوہ ایک دن اور تھا، لہٰذا سوچا کہ کچھ مشہور چیزیں دیکھ لی جائیں۔ اور دیکھیں بھی، جیسے وکٹوریہ میموریل حال اور چڑیا گھر یا بازار وغیرہ۔ سچ کہا جائے تو ان سب سے زیادہ جو شئے مجھے یاد رہ گئی وہ ان سب سے الگ تھی۔ مگر اُس کا ذکر بعد میں چونکہ یہ سب باتیں کلکتے کے اس مختصر سے سفر کی یاد سے یکے بعد دیگرے جڑی ہیں۔ کلکتہ کی سب سے حسین اور پر شکوہ عمارت وکٹوریہ میموریل ظاہر ہے کہ نہایت شاندار ہے۔ اس کی تعمیر سلطنت اِنگلشیہ کی معراج کا پتہ دیتی ہے۔ اس کا تصور اس وقت کے وائس رائے لارڈ کرزن کا تھا مگر اس کی تعمیر کا سہرا شہرۂ آفاق معمارِ اعظم، سر ولیم ایمرسن کو جاتا ہے۔ اس کا سنگِ بنیاد سن انیس سو چھ (۱۹۰۶ء) میں برطانیہ کے شہزادے نے رکھا اور اس کی باقاعدہ رونمائی ملکہ وکٹوریہ کی یاد میں سن انیس سو اکیس (۱۹۲۱ء) میں ہوئی۔ برطانوی اور مغلیہ فن یکجا ہو کر اس طرح کے شاہکار کی شکل اختیار کرتا مجھے اور کہیں نظر نہیں آیا۔ اس عجائب خانے کے اندر، سکّے، مہریں، ہتھیار، نقشے اور بہت سی دلچسپ چیزوں کے علاوہ ملکہ وکٹوریہ اور شہزادہ رابرٹ کی مصوّر

شبیہات اور ملکہ کی زندگی کے مختلف ادوار کی تصاویر بھی ہیں۔ انگریزی راج کے خاتمے کے بعد کچھ مجاہدینِ آزادی کی تصاویر اور بعض دوسری چیزیں بھی اس حال کی زینت بنی نظر آتی ہیں۔ حال کے اندر مصوری اور سنگتراشی کے ایسے نادر نمونے نظر نواز ہوئے کہ بھولنا مشکل ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ تصاویر ایسی کہ نقوش وغیرہ اُبھارنے کے لیے ایک طرح کی مجسمہ سازی سے بھی کئی جگہ مدد لی گئی ہے۔ یعنی تصاویر میں ملبوسات اور بعض دوسرے نقوش کو روغن کے علاوہ پلاسٹر آف پیرس یا دھات جیسی چیزوں کے ذرا ذرا سے استعمال سے ابھار اور سنوار کر گویا زندہ جاوید سا کر دیا گیا ہے۔ اور مجسموں کا تو عالم ہی سَحر انگیز ہے۔ ہلکے رنگوں کی آنکھوں کو جس انداز سے واضح کیا گیا ہے، وہ قابلِ دید ہے۔ یعنی سفید سنگ مرمر کے مجسمے میں آپ آنکھ کا رنگ کیسے دکھایئے گا؟ ان جادوئی ہاتھوں والے فن کاروں نے اس میں معجزے کر دکھائے ہیں۔ سیاہ پُتلی کی جگہ، آپ پُتلی کا حصہ خالی کر دیں تو پس منظر کے اندھیرے کے سبب یوں معلوم ہوتا ہے کہ پُتلی سیاہ ہے۔ مگر ہلکے رنگوں کی نیلی، ہری بھوری، پیلی، مٹیالی یا سرمئی سی پُتلیوں کو آپ کیسے واضح کیجیے گا، جب تک کہ آپ حیرت انگیز طور پر کوئی ماہر فن کار نہ ہوں۔ تو جناب بس اتنا کیا ہے مجسمہ ساز نے کہ آنکھ کی پتلی والے حصے میں دائروں کی جسامت اور تعداد بدلنے کے علاوہ مبہم سا تراش کر ہلکے رنگ کی اور ذرا گہرا یا ذرا زیادہ گہرا تراش کر ذرا کم ہلکے رنگ یا اور کم ہلکے رنگوں کی جدا جدا پتلیاں واضح کر دکھائی ہیں۔ ہے نا حیرت انگیز قسم کی فنکاری۔ خیر یہ تو تھا میوزیم کا معاملہ۔

چڑیا گھر کیا کرتی جا کر؟ جانتی تھی کہ چڑیا گھر صرف نام کے ہی لیے چڑیوں کا گھر نہیں ہوتا، اس میں چڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ بس ان کے شوق میں چل دی۔ داخلے کے قریب ہی ایک وسیع وعریض پنجرے میں بے شمار آسٹریلیائی

چڑیاں چہک رہی تھیں۔ نیلی، پیلی، ہری، سفید۔

مُنّی سی خمیدہ چونچ اور ہلکے گلابی پنجوں والی چڑیوں نے چہک چہک کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ پنجرے کی بڑی سی دیوار کے ساتھ گز گز بھر کے فاصلے سے مٹی کی چھوٹی چھوٹی ہانڈیاں باندھ دی گئی تھیں۔ ہانڈیوں میں ایک ایک گول سوراخ تھا۔ اتنا ہی جس میں سے چڑیا صاحبہ کا ننھا سا بدن بآسانی گزر سکے۔ چڑیاں ہانڈی کے منہ سے اندر جاتیں تو کبھی سوراخ سے۔ بڑی پھرتی سے آتی جاتی لطیف سی چہکار چھیڑے رکھتیں۔ چڑیوں کا مشاہدہ میرا محبوب ترین شغلہ ہوا تو پورا چڑیا گھر دیکھنے کو کس ناداں کا جی چاہتا۔ میں وہیں سامنے ذرا سی اُٹھی ہوئی منڈیر پر بیٹھ گئی اور مگن ہو گئی پنجرے کے اندر کی اس معصوم اور بھولی دنیا کو نہارنے میں۔ بڑی دلچسپ اور منفرد دنیا ہے پرندوں کی، مگر انسانوں سے الگ بھی اور انسان جیسی بھی۔ آسٹریلیائی چڑیوں کے گھونسلے بس مٹی کی یہ ہانڈیاں ہی تھیں۔ اتنے حسین پرندے کے تصور کے ساتھ ایک ننھے سے آشیانے کا خیال ابھرتا ہے جس میں منے منے تنکوں اور نرم نرم پروں والی کوئی پیالہ نما سی نشست گھنی شاخوں والے کسی درخت کی چھوٹی ٹہنیوں کے درمیان پھنسی ہو، جہاں سے موتیوں سی آنکھوں والے یہ بھولے بھالے ذی روح چہکا کرتے ہوں، مگر یہاں معاملہ دوسرا تھا، کیوں کہ یہ چڑیاں ہی الگ سی ہیں۔ خالی خُولی ہانڈی میں رہ کر بھلا یہ انڈے کہاں دیتی ہیں اور انہیں سیتی کیسی ہے۔ تو وہ ایسے کہ گھاس یا تنکوں کی جگہ ہنڈیا میں رہنے والے جوڑے کی جمع شُدہ بیٹیں ہی رفتہ رفتہ خشک ہوتے ہوئے سفوف سا بننے کے بعد آنے والے مہمانوں کے نرم بچھونے کے طور پر کام آتی ہیں۔

'آسٹریلیائی لَو برڈ' کہلانے والا یہ پرندہ محبت کے معاملے میں

اتنا وفادار ہے کہ ساتھی کے بچھڑنے کے غم میں جان دے دیتا ہے۔ دانہ چگنا یا چہکنا یکسر چھوڑ دیتا ہے اور کئی دن خاموش، پنجرے کے کسی گوشے میں بیٹھا بالآخر گر جاتا ہے، مر جاتا ہے اور ساتھ میں ان میں دلچسپی لینے والے مجھ ایسے رقیق القلب لوگوں کو کئی دن تک غم زدہ کرنے کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ بہت پہلے میں نے یہ پرندے گھر میں پالے تھے کہ ان کی بولی نہایت ہی سریلی ہوا کرتی ہے۔ ایک پرندے کا چہکنا یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کئی پرندے چہک رہے ہوں۔ ہماری عام بلبل سے اس کی چہکار ملتی ہے۔ مگر نغمہ الگ انداز کا اور زیادہ شیریں ہوتا ہے، اور کئی سیکنڈ مسلسل گایا جانے والا بھی۔ میری ایک چڑیا کے پنجے میں جانے کس طرح ہلکا سا زخم ہو گیا تھا۔ وہ ایک پیر پر کھڑی رہنے لگی تھی۔ مگر جب بھی کھڑی ہوتی، چڑا کھانا پینا چھوڑ کر اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا اور وہ چڑے کے ساتھ گاؤ تکیے کی طرح ٹیک لگا کر دانہ چگا کرتی۔ کبھی کبھی مجھے جانور انسانوں سے زیادہ سمجھدار معلوم ہوا کرتے ہیں۔ گو کہ یہ بھی انسانوں کی طرح لڑتے ہیں۔ نَر پرندے ان کے یہاں بھی خوب لڑتے ہیں اور مارنے مرنے پر تل جاتے ہیں۔ حریف کو دیکھ کر بیماری میں بھی حملہ کرنے کو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسی بے لوث محبت کرنے والے ان پرندوں کی یہ جنگجویانہ خصلت کچھ عجیب لگتی ہے۔ ویسے بھی میں محبت کی صرف ایک ہی شکل کی سچائی پر یقین رکھتی ہوں اور وہ ہے ماں کی اپنی اولاد کے تئیں محبت۔ یعنی اس کا الٹ نہیں کہ اولاد ماں سے وہ محبت نہیں کر سکتی جو ماں اولاد سے کرتی ہے۔ آٹھ نو برس کی عمر تک بچے کو ضرورت ہوتی ہے ماں کی اور بعد میں عام رشتوں کی طرح اس رشتے میں بھی مروّت ہی مروّت ہوا کرتی ہے۔ ضرورتوں اور مروّتوں کی حد بندی کہاں قائم کی جائے، یہ سمجھنا مشکل ہے۔

بات یہ کہنا تھی کہ چڑیا گھر سے لوٹ کر جب میں کلکتے یا کولکاتا کے مصروف بازار سے گزری تو یادوں میں ایک اور چیز محفوظ رہ گئی جو اصل میں مجھے کہنی ہے۔ وہ بھی مصوری اور سنگتراشی کے نادر نمونوں کی عظمت اور چڑیوں کی معصومیت سے کسی طرح کم دلچسپ نہیں۔ بازار میں عمارتوں کے طویل سلسلے کی بڑی دوکانوں کے سامنے کے چوڑے احاطوں کے باہری کناروں پر کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی متحرک دوکانیں بھی تھیں جیسی بڑے بازاروں میں ہوا کرتی ہیں اور عمارت کے قدرے ٹھنڈے برآمدوں کے گوشوں میں کہیں کہیں مستقلاً حق جمانے والے بھکاری بھی بیٹھے تھے۔ وہیں میں نے ایک بڑی سی ہاتھ گاڑی سے پانی کی بوتل خریدی۔ کچھ گھونٹ بھر کر اور بوتل کو شانے سے لٹکتے بیگ کے حوالے کر کے آگے بڑھنے لگی تو دیکھا کہ ایک کونے میں ایک بوڑھی عورت سامنے کپڑا بچھائے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پانی کی قیمت ادا کرنے کے بعد بچی ریزگاری جو میرے ہاتھ میں تھی، میں نے اس کے سامنے بچھے رومال پر رکھ دی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر سر خم سا کیا تو میں ہلکے سے مسکرائی۔ دھان پان سی اس بُڑھیا کی عمر پچھتّر اسی سال کے درمیان رہی ہوگی۔ اس نے پرانی سی ایک سوتی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس کے، دھوپ سے مزید سیاہ پڑے، نمایاں ہڈیوں والے شانوں پر کوئی بلاؤز نہیں تھا، جیسا کہ کہیں کہیں اس خطے میں رواج رہا ہے۔ اصل میں ہندوستان میں صدیوں تک درج فہرست ذاتوں کے لوگوں کو اوپری بدن ڈھکنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں پر ایک موٹا سا چشمہ تھا مگر چشمے کا ایک ہی شیشہ سلامت تھا۔ وہ بھی کیا سلامت تھا کہ اس پر بہت سی خراشیں تھیں۔ اور صرف بڑی بڑی چیزیں ہی نظر آسکتی تھیں، جیسے راستے، عمارتیں، گاڑیاں وغیرہ۔ بُڑھیا سر جھکا کر رومال پر رکھی ریزگاری کو شمار کرنے کی کوشش کرتی دانتوں سے

عاری دہانے والے جبڑے کو اوپر نیچے کر رہی تھی۔ ہاتھ گاڑی پر ڈبہ بند مشروب اور پھل بھی رکھے تھے۔ اُن میں سے بُڑھیا کے کھانے کے لائق صرف کیلے تھے۔ میں ایک درجن کیلے خرید کر اس کے پاس آئی تو اس نے سر اٹھا کر مجھے اور میرے ہاتھ میں لٹکی تھیلی سے جھانکتے پھل دیکھے۔ اس کے چہرے پر ایک روشن سی چمک چھا گئی اور ہونٹ پیاری سی مسکراہٹ میں پھیل گئے۔ ننھے سے غار ایسے دہانے میں جیسے اس کی زبان گول مول ہو کر بیٹھ گئی اور ٹوٹے شیشے والی آنکھ میں تشکر ہی تشکر ابھر آیا۔ جی چاہا اس کے پاس بیٹھ جاؤں اور اسے کیلے کھاتے نہارا کروں کہ ایک تو مجھے اس نئے شہر کی مصروف سڑکوں پر کوئی نہیں جانتا تھا اور دوسرے اگر جانتا بھی تو مجھے کچھ ایسی پرواہ نہیں تھی کہ انسانیت سے جڑے اور محبت میں لپٹے یہ سادہ سے معاملات میری زندگی کے اہم جزو رہے ہیں۔ تو خیر! میں نے بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر دکھائی۔

''جول۔؟'' میں نے پوچھا۔ جل ہندی میں پانی کو کہتے ہیں اتنا میں جانتی ہوں اور اُدھر کے خطوں میں زبر والے الفاظ بولتے وقت لوگ 'واؤ' کی آواز سے کام لیتے ہیں۔

''نا'' وہ سرنفی میں ہلا کر بولی اور پھر اپنی بنگلہ بھاشا میں اور بھی کچھ بولی جو میں سمجھ نہیں سکی مگر اس کی آواز کی مٹھاس میں محبت ہی محبت تھی اور اندازِ بیان میں دعائیں ہی دعائیں تھیں۔ اسے پانی نہیں چاہیے تھا تو اس نے ایمانداری سے بغل میں دیوار کے ساتھ لگی ڈھکی ہوئی ڈوپچی دکھائی جس میں شاید پانی تھا یا گھر لوٹتے وقت اس میں دودھ لے جایا جاتا ہوگا۔ وہ کیلا چھیل کر مسوڑھوں سے دھیرے دھیرے چبانے لگی تو میں وہاں سے واپس مڑی۔ مڑتے وقت میں نے یہ بھی دیکھا کہ دو چھوٹے چھوٹے سکولی بچے اس کے پاس آئے تو اس نے رومال

پر کیلے پھیلا دیئے۔ اس پر بچے اور وہ بوڑھی عورت تینوں مسکرانے لگے۔ یعنی وہ تینوں بچے مسکرا رہے تھے۔ دو کم عمر معصوم بچے اور ایک عمر رسیدہ معصوم بچی۔ یعنی وہ ان کی دادی یا نانی رہی ہوگی۔ ایسے ہی بڑے شہروں کے معاملے ہوا کرتے ہیں۔ بچوں کے ماں باپ کہیں کام وام سے نمٹ کر لوٹتے ہونگے، اس وقت تک گرم نم ہواؤں والے شہر کی اس بلند و بالا عمارت کی قدرے کم گرم فرشی منزل کے گوشے میں ایک بوسیدہ سے چوکور کپڑے کے اطراف تین معصوم بچے اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور ننھے منے غم بانٹا کرتے ہونگے کہ دو ننھے بچوں کی یہ بوڑھی اماں بھی اصل میں انہی کے زمرے میں شمار کی جاسکتی ہے کیونکہ بڑھاپا بچپن کی ہی طرف اُٹھنے والا آخری پڑاؤ ہے۔ یہ عمر رسیدہ بچے، ننھے بچوں سے کسی بھی طرح کم معصوم اور کمزور دل نہیں ہوتے۔ ان کی خوشیاں بھی کھلونا ملنے کی خوشیوں جیسی ہوتی ہیں۔ اور ان کے دکھ بھی کھلونا ٹوٹنے کے دکھ کی طرح ہوتے ہیں۔ انہیں بھی وقت پر خوراک نہ ملنے پر ایسے ہی رونا آتا ہے جیسے بچے دودھ کے لیے روتے ہیں۔ خلوص و محبت ملنے پر یہ بھی بچوں کی طرح غیر کے ہو جاتے ہیں اور لا پرواہ قسم کے اپنوں سے دور ہونے لگتے ہیں۔ انسان کی اصل فطرت جیسے ننھے بچوں کے مشاہدے سے معلوم ہوتی ہے، بالکل ایسے ہی بزرگوں کے اطوار سے بھی پتہ چلتی ہے کہ زندگی کی حقیقی شکل عمر کے ان ہی دو درجات میں عیاں ہے۔ ان درجوں کے درمیان سے گذرنے والا وقت تو دنیاداری، وقت شناسی اور رکھ رکھاؤ کے علاوہ بعض اوقات نفع، اور تصنع کا ہوتا ہے جس میں غرض، لالچ، بدد ماغی اور ظلم تک شامل رہتے ہیں اور ان کا غلبہ بھی کچھ ایسا ہوا کرتا ہے کہ فطرتِ انسانی کہیں دب جاتی ہے جو بعد کو بڑی عمر تک پہنچتے ہی لوٹتی ہے۔ مگر بزرگوں کے اس لوٹے ہوئے بچپن کے کئی فوائد بھی ہوتے ہیں۔ وہ عام انداز میں کی ہوئی بات

کے اندر زندگی کے کسی بڑے تجربے کی مثال پیش کرتے ہیں۔ کئی مشوروں میں بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہیں اور ان کی یہ باتیں گھر کے لوگوں کے لیے مفید بھی ثابت ہوتی ہیں۔

یہ بزرگ جنہوں نے اولاد کے پہلے قدم پر بتاشے بانٹے ہیں، شیرینیاں برسائی ہیں اور قند کی ڈلیوں سے لوگوں کے منہ میٹھے کیے ہیں، اس بات کا مکمل حق رکھتے ہیں کہ ان کے تھکتے ہوئے قدموں کو ہر طرح کا سہارا میسر ہو۔ اُبھری نسوں والے جن ہاتھوں سے انہوں نے کبھی اپنوں کی پرورش و پرداخت کی ہے، انہیں تھام کر ان کی زندگی کے اس آخری پڑاؤ کا سفر آسان کیا جائے۔ جو گھر انہوں نے اولاد کی محبت میں زندگی بھر کی کوششوں، محنتوں، محبتوں اور دعاؤں سے تعمیر کیے ہوں، ان پناہوں سے انہیں محروم نہ کیا جائے اور نہ ان کی دیواریں ان کے لئے زِنداں کی صورت ہو کر رہ جائیں کہ بزرگوں کو لے کر سیر کو جانا، بازار گھمالانا، رشتے داروں یا ملنے والوں سے ملوانا باعث شرمندگی نہیں ہوا کرتا، اس کا ہر پہلو محبت اور معصومیت سے تعبیر ہوتا ہے اور دنیا کا حسن اسی پر قائم ہے ورنہ وقت ہمیشہ کی طرح خود کو دہرائے گا اور ہم ناعاقبت اندیشوں پر بھی یہ دن ضرور آئے گا۔

آیئے، نمایاں نسوں اور سوکھی جلد کے اندر چرمراری ہڈیوں والے ان کمزور ہاتھوں کو ایسے تھام لیں کہ بجھتے دِیے سی ان آنکھوں میں پھر سے کامیاب زندگی کے خوابوں کی اُمیدیں جگمگانے لگیں خواہ زندگی ذرا سی ہی بچی ہوئی کیوں نہ معلوم ہو، کیوں کہ محبت معجزے کیا کرتی ہے۔ ہاتھ بڑھایئے اور اپنی محبت کا اعجاز دیکھیے۔ ہمارے خلوص کے واضح اظہار سے ان کی عمر لمبی ہو جائے گی۔ بڑھاپا اپنے آپ میں ایک لاعلاج عارضہ ہے۔ ہمارے خلوص کے مرہم سے

انہیں درد سہنا آسان ہو جائے گا۔زخم مندمل ہو جائیں گے۔ نیم فضول شے کی طرح ادھر اُدھر بکھری ماضی کی ان عظیم نشانیوں کو جب تک ہو سکے ہمیں سنبھال کر رکھنا ہوگا تا کہ ہم اپنے ضمیر کے اندر موجود احساسِ جرم کے رہ رہ کر اُٹھنے والے وسوسوں سے نجات پائیں کہ یہ ہی وہ واحد دنیاوی کام ہے جو چند عظیم ترین کاموں میں شمار ہوا کرتا ہے۔نیک اعمال عبادت سے الگ نہیں کہ

بندگی سے کہاں کچھ کم ہے کوئی کام کا پل
محنتیں عرش پہ جاتی ہیں دعاؤں کی طرح

ترنم ریاض

☆☆

سوامی وِویکانند جی

جنوری کی بارہ کو ہندوستان میں سوامی وِویکا نند کا ایک سو پچاسواں جنم دن منایا گیا۔ انہوں نے مہاتما گاندھی سے پہلے کہا تھا کہ خدا مفلس و نادار کے دل میں رہتا ہے۔ ایک ایسی شخصیت کی اس سماج کو جتنی ضرورت صدی ڈیڑھ صدی پہلے تھی اتنی ہی اب بھی ہے اور اگر مجبوروں کا استحصال اسی رفتار سے ہوتا رہا تو صدی بھر بعد کے متعلق بھی کچھ ٹھیک نہیں کہا جا سکتا۔ وِویکا نند و جو رام کرشن پرم ہنس کے مرید تھے، اُنہیں کی طرح انسانیت اور انسان کے لئے گہری محبت رکھتے تھے اور شاہ اور گدا دونوں کی صحبت کو یکساں اہمیت دیتے تھے۔ ہاتھ گاڑی پر چیزیں بیچ کر روزگار کمانے والے کے ساتھ کھانا بانٹ لیتے تو کبھی جوتوں کی مرمت کرنے والے سراج (یعنی شُودر جسے برہمن اچھوت سمجھتے رہے ہیں) کے ساتھ حقے کا کش لگا لیتے۔ وہ کہتے تھے کہ مورکھ (احمق) ہونے سے ناستک (لامذہب) ہونا اچھا ہے۔ ہر ہندوستانی نے وِویکا نند کا نام بچپن سے ہی ایک عظیم شخصیت کے طور پر سنا ہے مگر ان کی کئی کئی جلدوں پر مبنی کتابیں بحرِ علم سمیٹے ہوئے ہیں۔ زندگی اور انسانیت کے بارے میں ان کا نکتۂ نظر ان کی تحریروں میں ایسے سامنے آتا ہے کہ علم کی نئی شمعیں روشن نظر آتی ہیں۔ کرم یوگ یعنی اعمال

سدھارنے کی تلقین کرنیوالے وِویکا نند، گوتم بدھ کے پرستار تھے اور زندگی کے بارے میں ان کے فلسفے کو اہم فلسفہ مانتے تھے۔ ان کی کہی باتیں آج بھی براہِ راست دل میں اترتی ہیں۔ مثال کے طور پر ذہنی آزادی کو وہ جسم کی آزادی سے اہم کہتے تھے۔ انگریز کی غلامی کے دور میں ان کی کہی باتیں دلوں پر مرہم کا کام کرتی تھیں اور جینے کا ایک نیا عزم عطا کیا کرتی تھیں۔ سوامی وِویکا نند اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہندو لوگ اسلام، مسلمان بادشاہوں کے خوف سے نہیں بلکہ ذات پات کی نفرتوں اور چھوا چھوت ایسی غیر انسانی چیزوں سے تنگ آ کر اپناتے رہے ہیں۔ وہ انسانی برابری کے زبردست حامی تھے اور سماج کے اندر ہر طرح کے بھید بھاؤ کے زبردست مخالف تھے۔ مختلف مذاہب کے سیاسی استعمال کو استحصال سے تعبیر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر کوئی مذہب انسان کے بنیادی حقوق کی نفی کرتا ہے تو وہ مذہب نہیں بلکہ شیطان کا رقص ہے اور جہنم کی طرح ہے۔ وِویکا نند اپنے گرو رام کرشن پرم ہنس کے الفاظ دہراتے تھے کہ ایک دوسرے کے مذاہب کی عزت ہی کافی نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر مذہب کی سچائی پر یقین کیا جائے۔ وہ کہتے تھے کہ قومی ترقی کے دوسرے معنیٰ لاکھوں قبیلوں کی شناخت کا خاتمہ اور موت ہے اور ان کو اپنی جڑوں سے اکھڑنے کے مترادف ہے، اور ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح یک قطبی تصور کے لادے جانے کی کوشش کے تحت، ترقی کے نام پر دنیا کو بازار بنا دیا گیا ہے اور پہاڑوں اور جنگلوں میں بسے قبائل اور دیہات کے لوگوں کی زمینیں خرید یا تقریباً چھین کر ان پر مِلیں لگائی جاتی ہیں عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں، کسان خودکشیاں کرتے ہیں، ان کو فراہم کیا گیا بیج بھی کم پیداوار والا ہوتا ہے اور سرمایہ دار کو تو گویا موسم بدلنے کے آلات تک میسّر ہیں۔ بارشیں نہ ہوں گی تو کسان کہاں

جائے گا۔ سرکار امداد مہیا نہ کرے گی تو کیا کھائے گا۔ قرضے کیسے ادا کرے گا۔ زمینیں بیچ ڈالے گا یا خودکشی کرے گا۔ وِویکا نند کہتے تھے کہ کتابیں اَن گنت ہیں اور وقت کم، لہٰذا، جو ضروری ہوں انہیں اپنالیں اور اسی معیار پر زندگی گزاریں۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ نسلیں کتابیں چھوڑنے سے گمراہی کے اندھے غاروں میں گرے جارہی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ان دیکھے بھگوان کی نسبت انسان کی انسان سے دوستی زیادہ اہم ہے۔ خواتین کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ مکمل عورت بننے کے معنی مکمل آزادی کے ہیں۔ انہیں عورت کے مکمل انسان ہونے پر کامل اعتماد تھا اور کہتے تھے کہ عورتیں اپنی تقدیر خود سنوار سکتی ہیں اور یہ بھی کہتے تھے کہ ساری خرابی اس لئے پیدا ہوئی کیوں کہ مردوں نے عورتوں کی تقدیر سنوارنا اپنے ذمے لے لیا ہے۔ سماجی فلسفی وِویکا نند کہتے تھے کہ ہندوستان کے غریبوں کو بھلا دیا گیا ہے۔ ان کی مشہورِ زمانہ تقریر کا جو انہوں نے شکاگو میں گیارہ ستمبر سن اٹھارہ سو تیرانوے (۱۸۹۳ء) میں کی تھی، کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے کہ اس میں کچھ بہت اہم نکتے اٹھائے گئے ہیں۔ 'مختلف مذاہب کی پارلیمان' کی طرف سے عزت افزائی کے لیے تقریر کے دوران انہوں نے کہا تھا کہ حسین دنیا کو لوگوں نے ٹکڑوں میں بانٹا تو اس کے خوف ناک نتائج نکلے جن سے دنیا میں تہذیبیں اجڑ گئیں، زمین خون سے بھرتی رہی اور اقوام فنا ہوتی رہیں مگر وِویکا نند کو امید تھی کہ خلوص اور ایثار کا جذبہ جیتے گا اور دنیا میں امن و امان ہوگا۔ ایسے صوفی منش سے جو صرف انتالیس (۳۹) سال اور کچھ مہینے جیے تھے، ابھی بھی بہت کچھ علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان کی زندگی کے بارے میں بہت سی باتیں دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بن سکتی ہیں۔ کچھ عرصے سے انہیں کچھ انتہا پسند گروہ ایک خالص ہندو وادی ثابت کر کے دیوتا کی طرح پُوجوانا چاہتے ہیں جب کہ وہ گوشت

پوست سے بنے ایک عظیم انسان تھے۔

دائرہ ساخت کا وِویکا نند کا گھر بھارت کے جنوبی خطے چنئی میں ہے۔ مغرب کے دورے سے لوٹ کر انہوں نے وہاں نو (۹) دن تک قیام کیا تھا۔اس کے بعد وہاں رام کرشنا مٹھ قائم کیا گیا ہے۔اب وہاں ہندوستانی ثقافت اور وِویکا نند کی زندگی کے بارے میں نمائش رہتی ہے۔ یہ عمارت سن اٹھارہ سو بیالیس (۱۸۴۲ء) میں تعمیر ہوئی تھی اور اُس سے پہلے فِرنگی تاجر وہاں شمالی امریکہ سے منگوائی برف کی سلیں آگے بیچنے سے پہلے ذخیرہ کیا کرتے تھے۔والد کی بے وقت موت کے بعد بڑے بیٹے نریندر ناتھ (وویکا نند) کو چھوٹے دس بہن بھائیوں کا بوجھ اٹھانا تھا۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کے چشم چراغ تھے مگر رشتہ داروں نے ان سے سب چھین لیا تھا۔ان کی موت سے صرف ایک ماہ پہلے عدالت نے ان کی جائداد کا فیصلہ سنایا تھا۔ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی مگر پھر بھی ان کے انسانیت کے ناطے خدمت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس سے عام انسان تو سبق سیکھتا ہی ہے مگر سیاستدان اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں کیوں کہ وقت آیا ہی چاہتا ہے جب یہ عام آدمی 'خاص آدمی' کا دامن پکڑ کر استحصال کا حساب مانگے گا۔

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے
(فیض احمد فیض)

☆☆

ذرا ہوشیار ہی رہنا۔۔۔

گزشتہ دنوں امریکہ میں بچوں کے سکول پر بیس سالہ نوجوان کے حملے جیسی خبریں اب وہاں کے تعلق سے بہت زیادہ چونکاتی نہیں ہیں۔ بلکہ دنیا بھر کے سیاسی اور سماجی منظر نامے پر یہ باتیں صادق آتی دکھائی دیتی ہیں مگر اپنی تہذیب کو تمام عالم میں بلند ترین مقام پر فائز سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا اس تہذیب کی اگر اوپری پرت ذرا سا سرکا کر دیکھی جائے تو اندر تعفن، اور خون کی بو جیسی گھناؤنی چیزیں ہی ملیں گی کہ اب ایک زمانے سے وہاں کردار، گفتار اور حرکات پر کسی قسم کی کوئی سماجی یا اخلاقی قدغن نظر نہیں آتی۔ خبر جاننے کے بعد یہ خیال آیا کہ کیا تہذیب کا ارتقا اپنے معنیٰ کھو چکا ہے۔ آخر اس تہذیب کی نقل دوسرے ممالک کس منطق کے تحت ضروری سمجھتے ہیں۔ دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ لوگ ترقی کے نام پر ایک عجیب قسم کی بے یقینی سے دوچار ہیں اور ان کا اب تک خود اپنا ہی تہذیبی موقف واضح نہیں ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھیے کہ جس ملک نے مغربی ممالک کی طرح جستہ جستہ اس نام نہاد ترقی کی راہ طے نہ کرتے ہوئے اچانک خود کو کیبل ٹی وی اور انٹرنیٹ کی وساطت سے ایک نئی دنیا میں پایا ہو تو کیسا محسوس ہوا ہوگا۔ جن روایات کے ساتھ آپ پلے بڑھے پروان

چڑھے وہ جاہلانہ کہلانے کے لئے تماشا بنائی جانے لگیں گی تو کیا ہوگا۔ چنانچہ وہی ہوا کہ جو تہذیب بچوں نے بزرگوں سے سیکھی وہ اچانک فرسودہ نظر آنے لگی۔ اِدھر شرم و حیا کو زیور سمجھا گیا تو اُدھر حقوقِ نسواں کا استحصال۔ ادھر بڑوں کے سائے میں دنیا کی اونچ نیچ سمجھنے پر زور، تو اُدھر اسی بات کو حقوقِ طفلی کا استحصال گردانا گیا۔ اِدھر بدن ڈھانپنا پاکیزگی کا استعارہ، تو اُدھر پچھڑا ہونے کی سند۔ اِدھر والدین کے ساتھ ایک گھر میں رہنا سعادت، اُدھر قد نکلتے ہی اپنی دنیا بسانے کے لیے بے سہارگی کی زندگی گزارنا خود کفیل ہونے کی کوشش کا جواز۔ اس صورتِ حال نے بچوں، بزرگوں، جوانوں، یعنی ہر نسل کو ایک عجیب سے کنفیوژن اور تناؤ میں مبتلا کر دیا ہے اور ایسی صورتِ حال جب پیدا ہوتی ہے جب انسان کے ہاتھ میں بہت کچھ نہ ہو، وہ فیصلہ لینے کے دوراہے پر کھڑا ہو یا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا ہو۔ اگر ایک دفعہ یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ نام نہاد ترقی درحقیقت سرمایہ داری اور خود غرض سیاست کی ملی بھگت کا ایک ناکام تجربہ تھی جو کسی بھی زاویے سے کامیاب نہیں ہو پائے، تو انسان اس کے مہلک اثرات سے کافی حد تک محفوظ محسوس کر سکتا ہے۔ ایک اور ستم یہ ہے کہ جو چیزیں مغرب میں ناکام ہو چکی ہیں، ہمارے یہاں متعارف ہونے تک ان کی اصلیت کے بارے میں کوئی جانتا ہی نہیں۔ کیونکہ بھولا بالا دیسی بابو اسے ہی ترقی سمجھتا ہے اور اس پر اس کا اعتقاد مضبوط کرنے کے لئے اس کی نیم بالغ (اور بالغ بھی) ذرائع ابلاغ سے کلّی طور پر متاثر اولاد اس پر یقین دلانے کے لئے بضد رہتی ہے۔ اور اُدھر اس ملی بھگت کو سوائے اپنے کسی کی پرواہ ہی نہیں کہ اس نے تو اپنے ہی باشندوں کو اپنے تجربے کا خام مال سمجھ کر استعمال کیا اور کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت سب ہی جانتے ہیں کہ پہلے ان کے لئے صنفی بے راہ روی کے تمام در

کھول دیے گئے پھر کردار کی ہر بلندی کو پستی کہہ کر غلط پروپیگنڈے سے مثالیں دیں اور بے کار قرار دے دیا۔ پرانی قدروں کی ناقدری نے ان باتوں کے حامیوں کی بھی جگہ چھین لی اور عمر رسیدہ والدین سڑکوں پر جینے اور بزرگ خانوں کی تنہائیوں میں تدفین کا انتظار کرتے نظر آئے۔ جوانوں نے مشوروں کے لئے ہم عمروں کی طرف رجوع کیا تو مزید بہک گئے اور پوری پوری نسل ایک مصنوعی زندگی جیتی دھکے کھاتی اکیلے روتی اور جرم کرتی دکھائی دی اور ہنوز دکھائی دے رہی ہے۔ وہاں تقریباً نصف فی صد لوگ اپنے ملک کی سیاسی پالیسی ہی سمجھتے ہیں نہ عالمی سیاست سے واقفیت رکھتے ہیں۔ علم کو وہ اساتذہ سے یا کتب خانوں کی اہم اور کمیاب کتابوں سے نہیں بلکہ ٹیلیویژن اور انٹرنیٹ کی نئی نئی ویب سائٹس، آن لائن بحث ومباحثے اور تازہ خبروں سے حاصل کرتے ہیں جن کی بیشتر اطلاعات صداقت پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ اُس فسانے پر ہوتی ہیں جو سرمایہ دار اور سیاست داں کی طرف سے عام لوگوں کے سامنے رکھے جانے کے لئے گڑھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس لاعلمی میں سرمایہ دار اور سیاست دانوں کی کوئی نسل شامل نہیں نظر آئے گی۔ مگر اس رجحان کو بڑھاوا دینے والی سازشی حکومتیں ایک ذرا اپنے عوام کا بھلا سوچتیں تو کبھی بھی ایسی چیزوں سے پابندی نہ ہٹاتیں جن سے گھر، ملک اور قوم برباد ہوتی ہو اور ساتھ ہی آنے والی پیڑھی کے تحفظ کا امکان بھی مشکوک ہوتا جائے۔ اس پر طُرّہ یہ کہ جب اقتصادی صورتِ حال ڈگمگا رہی ہو اور کرنسی گر رہی ہو تو دماغی صحت کا متاثر ہونا عجب نہیں ہے۔ اپنی نسل کو دوسری ہر نسل سے بلند اور برتر کہہ کہہ کر ان کے اندر جب ایک کھوکھلا احساسِ برتری پیدا کیا جاتا رہا ہو تو یہی ہوگا۔ کیا تاریخ دان 'وُونڈِڈ نی مساکر' اور 'ٹرایل آف ٹیئرس' جیسی اصطلاحات بھول سکتا ہے۔ نرگسیت کا یہ عالم ہو اور حالات کچھ اور کہتے

ہوں تو حواس پر قابو کھونا ایک عام واقعہ ہو جاتا ہے کہ احساسِ کمتری ہی برتری کا مظاہرہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جب نسلیں ہر طرح کی بے یقینی سے دوچار ہوں تو جرم اور سزا کے بارے میں انہیں کم کم ہی سوجھا کرتا ہے۔ دو اشیاء ایسی ہیں جو اب صدی بھر سے ہر جگہ بیچی اور خریدی جاتی ہیں، بھلے ہی بظاہر ان پر کہیں پابندیاں بھی لاگو ہوں۔ ایک ہوش گم کرنے والی چیزیں اور دوسرا ہتھیار۔ تو ایسے میں نوجوان نسل کو جو بھی چیز حاصل ہوگی، وہ اس کا بیجا استعمال کرنے سے چوکے گی نہیں چاہے اس میں کتنے ہی خطرات ہوں۔ چاہے اپنی صحت سے نشہ کر کے کھلواڑ کیا جائے، بارود ایسی چیزوں سے دوسروں کی اور اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا جائے یا معصوم جانیں اور عزتیں پامال کی جائیں، ان کے لئے سب چلتا ہے۔ عالم بھر میں یہ زہر پھیل چکا ہے، کہ پرسکوں ممالک میں بکے ہوئے لوگ ابھرتے ہیں اور کسی اور کی زبان بول کر اپنی ہی جڑیں کھودنا اصول بنا لیتے ہیں۔ پانی ٹخنوں تک آیا چاہتا ہے۔ بچاؤ کے لئے انسان دوست اور دور اندیش قانون کی دیانتدارانہ اپروچ مسئلوں کا واحد حل ہے اور یہ جب ہی ممکن ہے جب سیاست شفاف ہو اور ذاتی مفادات کو ملک وقوم کے مستقبل سے پرے رکھا جائے۔ فی الحال یہ مشکل نظر آتا ہے کہ ہم لوگ بھی نقل کرنے میں فخر محسوس کر کے ڈارون کی تھیوری کو سچ ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں اور برائیاں ہیں کہ وبا کی طرح شرق و غرب میں تمیز کرنا نہیں جانتیں۔ آدم لانزا نے اپنی ماں کو بھی ہلاک کیا، بے گناہ اساتذہ اور معصوم بچوں کو بھی۔ ایسا وہاں پہلے بھی کئی نوجوان کر چکے ہیں۔ یہ نسل چونکہ قد سے بڑی اور ذہن سے نازک ہوا کرتی ہے، بڑا احساس طرزِ عمل طلب کرتی ہے۔ کہاں کہاں کیسی کیسی خرابیاں ہیں ٹھیک کرنا ہوں گی مگر اس وقت تک کیا دنیا صرف بُری خبروں کی منتظر رہے گی؟

''ذرا ہُشیار ہی رہنا، نہ جانے آئے گی کس سمت سے گولی
نقابوں میں چھپائے منہ، عجب مخلوق پھرتی ہے
کہیں چہرہ نہیں کوئی، کہیں چہرے پہ چہرا ہے
ذرا ہُشیار ہی رہنا
مگر ہُشیار رہ کر بھی کروگے کیا، کہ جانے آئے گی کس سمت سے گولی''

(ت ر)

☆☆

ذہنِ انسانی اور سادیت پسند مشاغل

اب کے عجیب وغریب خبروں کا سلسلہ سا چل نکلا ہے۔ آئے دنوں ایسی خبریں آتی ہیں جن سے 'حقوقِ بشری'، اور 'جانوروں کا تحفظ' جیسے استعاروں کے معنیٰ شکوک کے دائرے میں آنے لگتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں جب انسان مہذب نہیں تھا تو کسی بھی سبب سے خون بہانے پر سوچتا نہیں تھا۔ اگر موقف ہلاکت ہی ہے تو سبب کا بہانہ بھی کس لئے۔ قابیل نے ہابیل کو کیوں مارا تھا۔ بغیر مارے بھی تو مسئلے حل ہوا کرتے ہیں۔ کیا یہ صرف انسانی انا ہے جو کشت وخون پر اتر آتی ہے یا اس مخلوقِ اشرف کے شعور کی کسی تہہ کے اندر کوئی ایسا جذبہ بھی رہا کرتا ہے، جسے سینچنے کے لیے انسانی ذہن میں زہریلے خیالات کو شعور کی کسی اور ہی تہہ سے غذا ملتی ہے۔ محاورہ ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ ہر ذی روح اپنے حصے کی زندگی لوحِ محفوظ پر لکھوا کر کرۂ ارض پر وارد ہوا ہے۔ حیوان اور حشرات الارض میں یہ چیز دیکھنے میں آتی ہے کہ طاقتور کمزور کو اپنی غذا بنانے کے لئے مار ڈالتا ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ حیوانات میں سوچنے، سمجھنے، رنجیدہ اور خوش ہونے کی حِسیات موجود ہیں، لیکن ان کے وہاں پیٹ پالنے کے لیے صدیوں سے مار کر کھا جانے کا طریقہ رائج ہے کہ ان کو کھانا پکانا نہیں آتا۔

ثابت ہوا کہ یہ عمل ضروریات زندگی میں شامل ہے۔ گوشت کا شوقین یہ آدم اپنی عادت کی تکمیل کے لئے اس زاویے سے سوچے بغیر، کہ مظلوم آنکھوں والے کسی جانور کا خون بہا ہے، گوشت کھا لیتا ہے۔ شوق سے کھائے، ورنہ ایک یقین کے مطابق تعداد میں بڑھتے ہوئے جانور ایک دن اسے ہی ہضم کر سکتے ہیں۔ مگر کیا یہ واجب ہے کہ یہ اشرف مخلوق بے زبان چرند کو خار دار زبان والے درندوں کا شکار ہونے کے بے رحم فعل کو دیکھ کر لطف بھی لیا کرے۔ کیا طاقتور کا کمزور پر حملہ کر کے اسے مسلوب کرنا قابل دید نظارہ ہے؟ مویشی جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو انہیں حلال کر کے کھایا جاتا ہے یا انہیں چڑیا گھروں کو بیچ کر پیسہ وصول کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ناگزیر معاملہ ہے۔ چڑیا گھر میں بچے اپنے بڑوں کے ساتھ درندوں اور پرندوں کو دیکھنے آتے، تو معلوم ہوتا تھا کہ بڑے بھی معصوم جانوروں کی سادہ اور غیر تصنع آمیز حرکات وسکنات کا مشاہدہ کر کے خوش ہوتے ہیں مگر اب ایسا نظر نہیں آتا کہ شر پسند انسان نے اپنے شغل کا ایک نیا طریقہ ایجاد کر لیا ہے، جس کے لیے اسے خام مال دستیاب کرنے والے اس کے بہت سے ہم خیال پائے جاتے ہیں۔ معصوم چوپایوں کو درندوں کی پناہ میں شیر چیتوں کے سامنے پہنچا دیا جاتا ہے تو درندہ اپنی اس خوراک کو چیر پھاڑ کر خون اور گوشت نوش کرتا ہے۔ مگر درندے کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے کہ اس کام میں اس کے یہاں کوئی ایذاء رسانی کا جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ اذیّت پسندی تو ان اذہان میں ہے جو ہزاروں روپے کے ٹکٹ خرید کر یہ 'تماشا' دیکھنے جایا کرتے ہیں۔ آخر کو، کیا یہ ان کے سادیت پسند ذہن کی خونی پیاس نہیں ہے جو وہ اپنے ہمراہ لائے بچوں کے اذہان میں منتقل کیے جاتے ہیں؟ قدرت کی بنائی حسین دنیا سے مسرت حاصل کرنے سے قطع نظر بھی جب انسان کو، دل بہلانے کی خاطر سائنس کے دیے

ہوئے مشاغل میسر نہیں تھے، تو وہ عجیب عجیب چیزوں سے تفریح کا کام لیا کرتا تھا۔ یاقوت جیسی آنکھوں والے ننھے ننھے بٹیروں کو لڑاتا تھا۔ بھولے بھالے کبوتروں اور مسکین مرغوں کی جنگ کراتا تھا۔ کتے، بھینسے اور ہاتھی تک لڑواتا تھا اور اس مشغلے کے ساتھ اس نے پیسہ کمانے کا تصور بھی جوڑ رکھا تھا مگر اب اس کے پاس کتنے ہی وسائل ہیں۔ برقی میڈیا ہے، پرنٹ میڈیا ہے، انسانی ہاتھوں سے سنواری ہوئی تفریح گاہیں ہیں، مصنوعی جھیلیں ہیں، جزیروں پر کثیر منزلہ عمارتیں ہیں، اس کے لئے آسمان کی سیر کے وسائل پیدا ہو رہے ہیں اور ایسی ہی اور بہت سی چیزیں ہیں، تو پھر اس کے اندر یہ شر پسندی کیوں ہے۔ اس کا تخریب کار ذہن تکلیف دیکھ کر کیوں مطمئن ہوتا ہے۔ اس کی 'سیڈسٹ' سوچیں اس ڈگر پر کب تک چلتی رہیں گے۔ قدرت نے ہر ذی روح کے اندر منفی اور مثبت جذبات رکھے ہیں۔ اگر انسان ان منفی جذبات کو قابو میں نہیں کر سکتا تو پھر یہ کون سی تہذیب ہے۔ کون کہتا ہے کہ انسان تہذیب یافتہ ہو گیا ہے۔ یہ تو ایذا رسانی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور اس جذبے کو طرح طرح سے سینچتا ہے۔ جنگ و جدل کی بنیاد لالچ جیسی منفی بات ہے لیکن دل کو خوش کرنے کا سامان تو ایک مثبت عمل ہونا چاہیے۔ اس میں بھی بہتے خون کا نظارہ کرنا اگر انسانی تسلی کا سامان ہو جائے تو اس سے افسوسناک کوئی اور بات نہیں۔ میں ان باتوں سے عاجز سوچوں کی یلغار میں فنا ہونے سے خود کو اس خیال سے بہلانے کی کوشش کرتی ہوں کہ یہ بات ہر ایک کے بس کی نہیں۔ سوچتی تھی کہ ایسے نظاروں سے وہ لوگ لطف اندوز ہوتے ہوں گے جو خود جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہوں۔ جیسا اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کشتی لڑتے پہلوانوں کو دیکھ کر سب سے زیادہ تالیاں وہی لاغر آدمی بجاتا ہے جو مدقوق نظر آتا ہو۔ اس بات سے تسلی تھی کہ ان چیزوں کے نظارے

میں فی الحال صنفِ نازک کو شامل ہوتے نہیں دیکھا کہ جب تک باپ بیٹے یہ 'ہلاکت' دیکھتے ہیں، ماں بیٹی کچھ ٹھنڈا ونڈا پی کر غم غلط کرتی نظر آیا کرتیں، کہ اپنی اپنی فطرت والا معاملہ ہے۔ اب مثال کے طور پر یہ ظرافت آمیز واقعہ بھی قابل غور ہو سکتا ہے۔ کچھ سال قبل، ہمارے قریبی علاقے کے ایک اعلیٰ افسر سے ان کے ایک ملنے والے نے پوچھا کہ وہ اپنے پالتو کبوتروں کے ڈربے کو بند کرنے اور کھولنے کے لیے روزانہ ہتھوڑی اور کیل کا ستعمال کیوں کرتے ہیں جب کہ اس میں وہ ایک زنجیر ڈال سکتے ہیں اور بآسانی اسے وقتِ ضرورت اتار بھی سکتے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر جو لطف مجھے اس کام میں آتا ہے اس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ پوچھنے والے صاحب کا تجسُّس اور زیادہ بڑھا۔ بولے کہ ضرور کوئی اہم بات رہی ہوگی۔ بتائیں گے تو آپ جیسی اعلیٰ شخصیت سے کچھ سیکھنے کا موقع ہمیں بھی ملے گا۔ افسر صاحب اپنی باریک تراشیدہ مونچھوں کے اندر کہیں مسکرائے اور پھر فوراً سنجیدہ شکل بنا کر منہ کا دہانہ، سوالی کے کان کے قریب لے گئے اور برا سا منہ بنا کر کہا کہ صاحب اصل میں ہماری بیگم کو کبوتر پسند نہیں ہیں۔ سوال کنندہ خواتین کے معاملے میں رقیق القاب واقع ہوئے تھے، افسر کی دماغی صحت کی طرف سے مشکوک ہونے پر حیرت سے انہیں دیکھنے لگے کہ گویا ع

زباں بگڑی تو بگڑی تھی
خبر لیجیے دہن بگڑا

اس پر افسر صاحب ہنسے اور بولے کہ یہ سب میں انہیں کو 'ٹینس' (Tense) کرنے کے لیے کرتا ہوں اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ اور دوسرے صاحب کچھ پل ہونقوں کی طرح انہیں دیکھا کیے مگر پھر خود بھی ان کی ہنسی میں

بخوشی شامل ہو گئے۔

اب سوچا جائے تو یہ حضرتِ انسان اپنی نفسیات میں خدا معلوم کیا کیا پیچیدگیاں چھپائے پھرتا ہے، اس کے کس جذبے کو کسی کی کس بات سے تسکین پہنچتی ہے، یہ معلوم کرنا بھی ایک تحقیق طلب امر ہے۔جس پر تحقیق ہو بھی رہی ہے۔ مگر اس کا جواب ہر انسان اپنے ہی طور پر دے سکتا ہے۔ دوسرے کی نفسیات کا تو صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے اور اندازہ ہمیشہ صحیح نہیں ہوا کرتا۔

اور اگر اس طرح کے واقعات پر غور کیا جائے تو اس میں بھی ایک تعلق کا پتہ چلتا ہے یعنی، بقول غالب 'کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی' یا بقولِ احمد فراز، 'رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لیے آ' جیسا کوئی معاملہ۔ایک اور مثال جسے خوش طبعی کے طور پر بھی لیا جا سکتا ہے لیکن دوسرا پہلو سنجیدہ ذہن کی پریشانی کا سبب بھی ہے۔ جیسے گزشتہ دنوں ایک اور خبر پڑھی تھی بلکہ خبر کے ساتھ سند کے طور پر تصویر بھی شائع کی گئی تھی جس میں بھاری تن و توش یعنی WWF کے 'یوکوزونا' قسم کے ایک جاپانی صاحب ایک روتے ہوئے ننھے سے بچے کو ہاتھوں میں اٹھائے اپنے چہرے کے روبرو کیے ہوئے پھولے گالوں اور ابھری پیشانی میں نیم پوشیدہ خطِ مستقیم جیسی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے، زبان لٹکائے ہیں۔ خیال آیا کہ وہ شاید بچے کو ہنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔خبر پڑھی تو پتہ چلا کہ 'یوکوزونا' قسم کے صاحب بچے کو ہنسا نہیں بلکہ دہاڑ دہاڑ کر ڈرا رہے ہیں۔ (منگولیائی نسل کے سب پہلوان مجھے ایک دوسرے کے جڑواں بھائی سے معلوم ہوتے ہیں۔) خیر! تو یہ تصویر وہاں کی کسی تفریحی تقریب کی تھی جس میں بعض نونہالوں کو Baby Crying Contest میں شامل ہونے کی غرض سے 'ٹوکیو' بلایا گیا تھا۔سب سے اونچی آواز میں رونے والا بچہ انعام کا حقدار قرار دیا جانا

تھا۔ میں حیرت زدہ رہ گئی کہ دھان پان سی ننھی جان کو مارے ڈر کے اگر کچھ ہو جائے تو؟ بھلا یہ کیسا تماشا ہے؟ اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب تماش بینوں میں خوش و خرم ماؤں کو بھی شامل دیکھا۔ صاف صاف عرض کردوں کہ میں بڑے کمزور اعصاب کی مالک ہوں، اگر کوئی چربی سے تھل تھل کررہے بدن والا 'یوکوزونا' اس طرح سامنے آ دھمکے او زبان نکال کر ڈرانا شروع کردے، تو یقیناً میں اسی لمحے اس جہانِ فانی سے کوچ کر بیٹھوں۔

غیر تہذیب یافتہ دور میں یہ شر پسند مخلوق زورِ بازو کے قانون کے علاوہ کسی اور شئے کا تصور نہیں رکھتی تھی۔ کبھی جب ایک شے کے دو دعویدار پیدا ہوتے تو مقابلہ آرائی میں جو زندہ بچ جاتا اس شے کا حقدار قرار پاتا۔ یعنی زر، زمین اور زن جیسی اہم چیزوں کا۔ زر اور زمین تو بے زبان چیزیں ہیں، کسی عمل پر معترض نہ ہوں گی۔ مگر دروغ برگردنِ راوی، کہتے ہیں کہ جب کسی حسینہ کے لیے مقابلہ ہوا کرتا تھا تو وہ بھی تماش بینوں میں بخوشی شامل ہوتی تھی۔ خیر، مگر وہ معاملہ تو قبائلی طرزِ زندگی کا تھا، مگر یہاں اپنے جگر کے ٹکڑوں کے اس مقابلے کا نظارہ زرق برق ملبوسات والی یہ نوجوان مائیں چہک چہک کر کر رہی تھیں۔ جب کہ یہ بچپن اور معصومیت کا سراسر استحصال ہے۔ اور ان ماؤں کو اللہ جانے یہ بات کیوں بھول گئی کہ بدلتی اقدار میں بچوں کے بڑے ہونے پر جب وہ ان کے بچپن کی اس مقابلہ آرائی کا آنکھوں دیکھا فلم بند حال ان کے روبرو پیش کریں گی تو وہ اپنی ماؤں پر حقوقِ طفلی کی پامالی کا دعویٰ ضرور کریں گے، مگر یہ دیکھنے کے لیے میری یہ گناہگار آنکھیں زندہ ہوں، جب نا!

☆☆☆

یہ بات ذہن نشین رہے کہ ترنم ریاض نسائیت کو ایک سوچے سمجھے موضوع یا طے کردہ نظریے کے طور پر پیش نہیں کرتیں۔ جیسا کہ بیشتر خواتین فکشن نگار اور مرد لکھاری کرتے رہے ہیں۔ ان کے علی الرغم ترنم ریاض کے یہاں ان کے باطن سے نمود کرتے ہوئے تجربات شعوری سطح پر لسانی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ فیض احمد فیض نے خدیجہ مستور کے بارے میں لکھا تھا کہ خدیجہ مصوری کم کرتی ہیں اور کشیدہ کاری زیادہ۔ یہ جملہ ترنم ریاض پر بھی صادق آتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ وہ کشیدہ کاری کرتے ہوئے مصوری بھی کرتی ہیں اور باطن وظاہر کے امتزاجی عمل سے، لسانی روانی اور شگفتگی سے ایک panoramic view خلق کرتی ہیں۔ وہ متعدد افسانوں میں افسانوی کردار کے ذریعے ایک خود آگاہ، باشعور اور دردمند شخصیت کا پتہ دیتی ہیں، غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں تکثیریت متعدد معنوی امکانات کا احساس دلاتی ہے۔ یہ امکانات وہ غیر مختتم دھارے ہیں جو وسیع تر استعاراتی عمل میں ان کے ہمہ گیر ممتا کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں۔ ترنم ریاض کے محاکے (assessment) کی کوئی کوشش اس وقت تک بارور نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان کے لاشعور کی inherent کارگزاری کا پتہ نہ لگایا جائے اور وادیٔ کشمیر (جو ان کا مولد ہے) کی بے مثال خوبصورتی کے ساتھ یہاں کے باسیوں کے صدیوں کی مجبور ومقہور زندگی کے لاشعوری اثرات کی نشاندہی نہ کی جائے۔

(پروفیسر حامدی کاشمیری۔ سرینگر کشمیر)

ترنم ریاض کا تازہ ترین ناول ''برف آشنا پرندے'' اپنے زمانی ومکانی تناظر کی حد تک خطہ کشمیر کے لازوال حسن، اس کی زخم خوردہ روح، قوت تحمل، ماضی کی خوابیدہ گزرگاہوں اور حال میں زندگی کے افق پر نئی تاب وتپش اور معنویت پر مبنی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔ ناول کا نام بظاہر اپنی ایک علامتی رمزیت کے باوجود معاشرتی حقیقت نگاری کے واضح میلان کا نمائندہ اور پریم چند کی قائم کردہ فکشن کی روایت کی ایک توسیع شدہ نئی حسیت اور شعور وآگہی کا حامل تخلیقی تجربہ ہونے کے سبب اپنی جانب خصوصیت کے ساتھ متوجہ کرتا ہے۔ بیسویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں جن فنکاروں کے ذریعہ مذکورہ روایت کو اردو فکشن میں اعتبار اور وقار حاصل ہوا۔ ان میں ترنم ریاض کے ساتھ سید محمد اشرف کا نام خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔۔۔

(پروفیسر قاضی عبید الرحمان حاشمی۔ جامعہ، دہلی)

ترنم ریاض الفاظ کی موسیقی سے زمینی حقیقت کی گرہیں کھولتی چلی جاتی ہیں اور اکثر مقامات پر خوشی، غم کے فرغل میں لپٹی محسوس ہوتی ہے۔ ترنم ریاض کے اظہار کی وسعتیں بیکراں ہیں۔۔۔

(ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور)

Author's photograph : Shikha Khanna

AJNABEE JAZEERON MEN

A Collection of Essays

by

Dr. Tarannum Riyaz

قدیم سلک رُوٹ جو تاشقند تک جاتا تھا کشمیر سے گلگت کو جوڑتا تھا۔ گریز کی وادی میں جو طلسمی حسن پھیلا ہے اس میں سوائے فطرت کے کسی کا عمل دخل نہیں ہے۔ فسوں کاری کی حد تک حسین اس وادی کے کچھ حصے دردستان سے بھی ملتے ہیں۔' پربت وہ سب سے اونچا جو ہمسایہ آسماں کا ہے' اس ندی کو ہرا ہرا پانی دیتا ہے۔ اس میں ننگا پربت سے بھی پانی اُتر کر آملتا ہے۔ وادیِ گریز سرینگر سے تقریباً ۹۰ کلومیٹر کی دوری پر ہے اور سطح سمندر سے قریب قریب گیارہ ہزار سات سو فیٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کے جنگلوں میں بُرزہ کے یعنی بھوج پتر کے درخت بکثرت ہیں، جن کے تنے اور ٹہنیاں ہلکے سفید ہوا کرتے ہیں اور جن پر اپریل مئی میں شگوفے آتے ہیں کہ انہیں پنپنے کے لئے بارہ ہزار فٹ کی بلندی کا سرد موسم درکار ہوتا ہے۔ اس درمیانہ قد درخت کی شفاف چھال بڑی باریک اور تہہ در تہہ جُڑی ہوتی ہے۔ ان ہی درختوں کی چھال کا اگلے وقتوں میں کاغذ کی طرح استعمال ہوا کرتا تھا۔ کچی دیواروں میں اس کی تہیں کچی اینٹوں کی تہوں کے درمیان بچھائی جاتی تھیں تاکہ بارش اور برف کے پانی کے حتی الامکان ایک تہہ سے دوسری تک نتھرنے میں کمی واقع ہو سکے۔ ہر چھلکے پر برابر کی دوری میں تھوڑی تھوڑی لمبی لکیریں نقش ہوتی ہیں۔ جیسے انسانی ہاتھوں نے ایک ایک، یا الف الف لکھا ہو۔ گریز کے باشندے دردشین قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی بولی دردی یا شینا کہلاتی ہے۔ بٹوارے تک یہ علاقہ گلگت سے جڑا ہوا تھا۔ پہلے یہ سارا خطہ دردستان کہلاتا تھا۔ اُس زمانے میں فرنگی اس کے پانیوں میں مچھلی کا شکار کرنے آتے تھے۔۔۔۔

(اسی کتاب سے)

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-571-8